زینہ ذات کا سفر اور میں

از

رفعت سراج

تاریخ آغاز:14062008
تاریخ اختتام:15062008
اسکیننگ :ایچ مطہرہ

ناول کا آغاز

شرمندہ میری روح کی سچائیاں ہوئیں
وہ تبصرہ ضمیر نے کردار پر کیا

آنکھ کھول کر اس نے اپنے چاروں اور نظر دوڑائی۔

کشادہ چھت ٹھنڈی ہوا، چڑیوں کی چہچہاہٹ، کوئل کی کوکو، ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے اپنے برابر والے پلنگ کی طرف دیکھا تو خالی تھا۔

وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ بھور بھیگ جس کی وہ اب آہستہ آہستہ عادی ہو چکی تھی۔

اری او۔ چھوری۔ جا اٹھا دے جا کر اوب جادی کو۔

ساس کی آواز پر وہ تیزی سے پلنگ سے اتر آئی۔ اس کی نند اسے زینے پر ہی مل گئی۔ وہ اس کی سمت دیکھنے بنا نیچے اتر آئی۔

کامن ایدھر کا کوئی نہ ہی جانے۔ ہر بخت اٹھلی رہوے۔ اس کی ساس لسی بلوتے ہو بڑبڑا رہی تھی۔ (یعنی کام کچھ نہیں جانتی ہر وققت فالتو بیٹھی رہتی ہے)

گھر کے مرد باہر جا چکے تھے۔

اس نے منہ ہاتھ دھویا اور مہمانوں کی طرح ایک طرف بیٹھ گی۔ اور کانپتی نظریں اپنی ساس کی سمت کیں جہاں بدمزاجی اپنے عروج پر تھی۔ اس کا دل سہم کر دھڑ دھڑ بجنے لگا تھا۔ سارا دن یونہی لرزتے کانپتے گزرتا تھا۔ شام ڈھلے البتہ اس کی سانسیں آزادی ہو جاتی تھیں۔ جب وہ تھکا ہارا آتا تھا۔ ہر چند کہ تب بھی وہ اس سے کترائی کترائی رہتی تھی۔ وہ لالٹین جلا کر طاق کی سمت بڑھتی تو اس کی نند بھائی کے سامنے کھانا سجا دیتی۔ وہ اس کی سمت دیکھتا۔ نظروں سے بلاتا۔ وہ دل سنبھالتی ساس کے نزدیک چولہے کے پاس جا بیٹھتی اور انگاروں سے کھیلنے لگتی۔ انگاروں سے کھیلنا شاید اس کی سرشت میں تھا۔ وہ زینے کے پاس بنی گھڑونچی سے پانی نکالنے لگتی تو پشت سے آواز آتی۔

اماں میں اوپر جا رہا ہوں سونے۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر زینے چڑھ جاتا۔ وہ ساس نندوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔ نندیں اسے سہیلیوں کے سسرالی قصے سنانے لگتیں ساس کو اپنی جوانی کی حیا اور پارسائی یاد آنے لگتی۔ ناپسندیدہ باتوں کے باوجود وہ سر جھکا بیٹھی رہتی۔ کتنے آنسو بیبسی اور شرمندگی کے سر مژگاں لرزنے لگتے۔ ساس اونگھنے لگتی۔ اس کی نند کروٹ بدل لیتی۔ تب بھی وہ کافی دیر بیٹھی رہتی۔ ان کی پھٹکاروں میں اسے پھر بھی آسودگی ملتی تھی۔ اور وہ جو اوپر تھا۔ اس کا منتظر اس کی عنایتوں پر بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا تھا۔ اس کی محبت اور گرم جوش نظریں اعصابی خلجان میں مبتلا کر دیتی تھیں اس کا رواں رواں پہلو چراتا تھا۔

مجھے مت چاہو مجھے نہ سراہو۔ مجھے اپنے حصے کا عذاب چکھ لینے دو۔

اس کی آنکھیں سولی کی نیند مانگنے لگتیں تب وہ بہ شکستہ قدموں سے زینے طے کرنے لگتی۔

ایک۔ دو تین زینے کوس بننے لگتے۔ فاصلہ لامتناہی۔

وہ بنا چاپ اوپر آتی تھی مگر وہ اسے دل سے سن لیتا تھا۔

آنکھوں پر دھرا بازو ہٹا کر اسے شاکی نظروں سے دیکھتا۔

سارا دن دھوپ میں جلتا ہوں۔ سارا تیرا دامن پھر بھی تنگ ملتا ہے۔

اس کی بات سن کر سارا کا رواں رواں سسکنے لگتا۔ وہ اپنے پلنگ کی سمت جاتے جاتے اس کی جانب آ جاتی اور اس کے پاس بیٹھ جاتی۔

یوسف۔ آپ مجھ سے اس طرح خفگی سے بات نہ کیا کریں۔ میں اپنا حرف حرف آپ کو پڑھوا چکی ہوں۔ پھر بھی آپ۔

اس کے آنسو روانی سے رخساروں پر بہنے لگتے۔ وہ بازو کے سہارے تھوڑا سا اٹھ بیٹھتا۔

سارا۔ تجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ میرا اندر باہر بالکل ایک جیسا ہے۔ میں نے تجھے اپنایا ہے۔ ثواب کمانے کے لئے نہیں حشر میں ملنے والے کسی انعام کی خاطر نہیں۔

میں نے تیرے اصل میں جھانک کر دیکھا ہے۔

یوسف میرا اندر بہت شور مچاتا ہے۔ یوسف جب میں اتنی گنہگار نہیں ہوں تو مجھے دوہرے عذاب کیوں ملے ہیں۔ لوگ مجھ پر یقین کیوں نہیں کرتے میرے امی۔ پاپا۔

گویا میں بھی عذاب ہوں تمہارے لیے۔ یوسف تم پر آ کر گویا سنجیدگی کو چھو گیا۔

نہیں یوسف آپ تو میرے محسن ہیں۔ اس نے تشکر کے احساس سے مغلوب ہو کر اس کے مضبوط ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

دیکھو سارا تم میری نیت پر شک کر کر کے ایک دن مجھے کھو دو گی کیوں مجھے روز تنگ کرتی ہو۔ میں دیہاتی ہوں سارا۔ میری زبان مرد کی زبان ہے۔ جو میرے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر، پڑھی لکھی ہو کر بھی تم میری بات کی تہ تک نہیں پہنچ پاتیں۔

چاند کی کرنوں نے اس کے اشکوں کی روانی خوب ظاہر کر دی تھی۔

وہ اب بھی رو رہی تھی۔

وہ روز اسے اپنی سچائی اور نیک دلی کا یقین دلاتا تھا۔

مگر نفسیاتی مضامین پڑھی بات اپنے دل سے نہ نکال پاتی کہ مرد یہ بات برداشت نہیں کر پاتا کہ اس کی بیوی کا ماضی کسی غیر مرد سے ایک لمحے کو بھی منسوب رہا ہو۔

بعض اوقات وہ گھبرا کر روتی تھی۔

بعض مرتبہ پچھتا کر روتی تھی۔

کئی مرتبہ اس کے ظرف، اس کی شدید محبت پر روتی تھی۔ وہ زچ ہو جاتا تو وہ ڈر بھی جاتی تھی۔

جیسے پھر خفا ہو گیا تھا۔

آپ اس طرح ناراض ہو جائیں گے۔ تو میرا ہارٹ فیل ہو جا گا۔ وہ اس کے شانے چھوتی۔

عجیب لڑکی ہو بات کروں تو مصیبت چپ رہوں تو مشکل۔ وہ مسکرا کر سیدھا ہو جاتا۔

یوسف مجھے سوا عزت کے کچھ نہیں چاہیے۔ اور عزت۔

وہ یوسف کے شانے سے ٹک کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ شیشے تو ٹوٹ چکے ہیں یوسف۔ وہ اس کے شانے تھپتھپاتا۔

اگر سارا تو میری بیوی نہ ہوتی تو میں تیرے ہر وقت بہتے آنسو بہانے کو تیرے من کا چور جان لیتا۔ تیرے ضمیر کی چبھن کہہ دیتا۔ تیرے شیشۂ عصمت میں لکیر دیکھتا مگر تو میری بیوی ہے۔ اور میں آنکھوں اندھا مرد نہیں ہوں۔ شوہر سے زیادہ اپنی بیوی کو کوئی نہیں جانتا۔ وہ بیوی کی عصمت کا معتبر گواہ ہوتا ہے۔ تجھے چھو کر خدا کی قسم۔ ایک بار کوئی بیایمان خیال میرے دل میں نہیں آیا۔ تجھے یقین کیوں نہیں آتا؟ سارے کھوٹ مرد برداشت کرسکتا ہے۔ مگر شاید یہی ایک کھوٹ ہے۔ جو اس کے ظرف سے بڑا ہوتا ہے۔

میری طبیعت کا اطمینان تیرے دل کو تسلی کیوں نہیں دیتا۔ کیوں وہم کی آگ میں جلتی ہے۔

وہ پھر خوش قسمتی کی باد نسیم بن کر اس کے اعصاب کو سکون بخشنے لگتا۔

وہ ایک بار پھر تیرہ بختی کے ناگوں کو زیر کرتی نئ صبح کی جانب چل پڑتی۔

وہ سب اپنے اپنے دھندوں کی سمت مڑ چکے تھے۔

لمبی اور گرم گرم دوپہر عفریت کی طرح اس کی سمت بڑھا ہی چاہتی تھی۔

پرسوں ہی تو اس نے ساس سے کہا تھا۔

اماں۔ ان کے لیے کھانا میں لے کر جایا کروں گی۔

بڑی بی نے اس کی سمت تعجب سے دیکھا پھر سخت ناگواری سے اس کی سمت دیکھنے بنا کہا تھا۔

دیکھ چھوری کوئی جروت (ضرورت) نہیں گھر سیباہر نکلنے کی۔ رحم کر بابا۔ پہلے چار آ گئے تھے اٹھان واسطے اب بارہ آ گئے پھر؟

گلے گلے پانی میں اتارنے کو اس کے لیے یہ بات کافی تھی وہ وہیں پتھر کی بن گئی تھی۔

جبکہ یوسف نے خود ہی اسے کہا تھا۔

بھری دوپہر میں جب میں شہتوت کی چھاؤں میں تیری راہ دیکھتا ہوں اور تو نہیں آتی۔ بھری دھوپ سر پر اتر آتی ہے۔ کیوں نہیں آتی؟ رات تو بہت دین سے آتی ہے ناں؟

تب اس نے سوچا تھا وہ اسے چھاؤں دے گی۔

مگر بڑی بی نے اب ہمیشہ کے لیے اس کی زبان بند کر دی تھی۔

پھر اس نے اماں کی یہ بات یوسف سے کہہ دی تھی۔ وہ سادہ سا نوجوان ماں کی بات پر تو چپ ہو گیا تھا۔ لیکن ایک صبح جاتے ہوا سے چپکے سے کہہ گیا۔

اماں اپنے بھائی سے ملنے ساتھ والے گاؤں جا رہی ہے میں انتظار کروں گا۔

اور بھری دوپہر میں جب اس کی نند عائشہ کھیت پر جانے لگی۔ بڑا سا کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر

اور ساتھ ہی بھائی کا کھانا لے کر تو وہ لپک کر اس کے پاس چلی آئی۔

عائشہ میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟

ہاں ہاں بھابھی ضرور۔ اماں بی تو تو بس ایویں ہی ڈر پڑ گیا ہے۔ چلو مل کر نہر پر کپڑے دھوئیں گے۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

تب اس نے کھانا اٹھالیا۔ چادر اچھی طرح لپیٹ کر وہ نند کے ساتھ باہر آ گئی۔

شہتوت کی چھاؤں میں بچھی چارپائی پر وہ بازوؤں کا تکیہ بنا غالباً راہ دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں کرنیں اتر آئیں۔ وہ کھانے سے زیادہ چادر سنبھال رہی تھی۔ یوسف نے دیکھا سا سے چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ پنسل ہیل والے سینڈل پہنے ہو تھی۔ غالباً اس کے پاس سادہ چپل نہیں ہے پتہ نہیں اس کے پاس کیا نہیں ہے؟ اور کیا ہے کتنا لاپرواہوں میں۔ اسے تاسف ہوا۔

وہ قریب آ گئی تھی۔ چادر ایک دم ڈھلک گئی وہ بوکھلا سی گئی۔ کھانے کے برتن بھی ہاتھ میں تھے۔ اس کی نند نہر کی سمت مڑ گئی تھی۔

وہ اٹھ آیا اور کھانا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

سرخ پھولدار سوٹ میں کچھ سورج کی تپش سے اس کے رخسار دہک اٹھے تھے۔

وہ وہیں کھڑی ہو کر چادر سنبھالنے لگی۔ یوسف نے اس کے سراپے پر حقدار نظر ڈالی اس کا شباب دیہاتی لڑکیوں جیسا تھا۔ اور روپ سے بےنیازی بھی انہی جیسی۔

اماں نے تمہیں قید کر دیا ہے۔ ہے ناں؟ وہ اس کو پڑھنے لگا۔

وہ جن باتوں سے بچنا چاہتی تھی وہی سامنے آجاتی تھیں اس کا ماضی برہنہ رقصاں ہو جاتا۔

ایسا بھی کیا بھلا۔ میرا تو برا ہی ہے دیکھنے کو ترس جاتا ہوں، گھر جاؤں تو عائشہ چھیڑنے لگتی ہے۔ اماں کو برا لگتا ہے۔ رات کو آدھا وقت تمہارے رونے اور سمجھانے میں گزر جاتا ہے۔

میں عائشہ کے پاس جاؤں اس کے ساتھ کپڑے دھلوانے ہیں۔

ارے تمہیں کہاں ان باتوں کی عادت ہو گی۔ دھو لے گی خود ہی۔ اب اتنا بھی شرمندہ نہ کرو۔

عادت توڑ ڈالنا پڑے گی ساتھ جو رہنا ہے آپ کے۔ اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

(مجھے تو مشین سے کپڑے دھوتے کوفت ہوتی تھی یوسف بعض اوقات چھٹی والے روز امی صبح ہی سے کہنا شروع کر دیتیں۔ سارہ مشین لگا لو بہت کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔ اور میں۔ آنسوؤں کے پھندے اس کے حلق میں اٹکنے لگے۔ مجھے کیا پتا تھا۔)

میں جاؤں۔ وہ اس کی خوبصورت گہری انکھوں میں اڈتی مردانگی سے سٹپٹا کر دوبارہ بولی۔

نہیں۔ وہ خاموش ہو رہی وہ کھانا کھانے لگا۔

اس نے کھیتوں کے چاروں طرف نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

یہ کھیتوں کے ایک سرے پر کوٹھری سی کیوں بنی ہوئی ہے؟ اس نے سادگی سے پوچھ لیا۔

شہتوت کی چھاؤں زیادہ ٹھنڈی ہے۔ اس کے انداز میں شرارت تھی۔

اور اس سے سر نہ اٹھایا گیا۔

یہ کھیتوں پر راکھی (رکھوالی) کرنے والے ہوتے ہیں ناں ان کے لیے بنا دیتے ہیں۔ بارش وغیرہ سے بچنے کے لئے راکھی کرنے والا وہاں چلا جاتا ہے اور دھوپ تیز ہو اور پاس سایہ نہ ہو تو بھی وہ اندر جا کر لیٹ جاتا ہے۔

راکھی کرنے والا رکھوالی تو آپ۔

شہر گیا ہوا ہے وہ۔ آجا گا دو چار دنوں میں تب تک تو میں ہی

وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرا دیا۔

وہ آجا گا تو میں شہر چلا جاؤں گا۔

آپ؟ وہ متعجب ہوئی۔

ہاں۔ میری ملازمت بھی ہے وہاں اور اس سال میں سی ایس ایس کے امتحان میں بھی بیٹھ رہا ہوں۔

وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ سول سپیریئر سروس۔

وہ اس طرح اسے دیکھ رہی تھی گویا اس کے وجود پر شک ہے آ۔ آپ۔

کیوں۔ کیا۔ ہم دیہاتیوں کو اعلی امتحانات دینے کا حق نہیں ہے؟

نن نہیں۔ مم۔ میر مطلب ہے۔ آپ؟

مجھے فوج میں جانے کا بیحد شوق تھا۔ مگر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے نہ جا سکا۔ سوچا پولیس آفیسر ہی بن جاؤں۔

وہ بے یقینی کی کیفیت میں اسی طرح کھڑی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ۔

اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ڈونٹ ڈاؤٹ۔ اٹ از ٹریو۔ (شک نہ کرو یہ سچ ہے)

اس کا تو گویا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اتنی رواں اور شستہ انگریزی ماموں جان نے یہ تو بتایا تھا کہ وہ پڑھا لکھا ہے وہ یہی سمجھی اتنا ہی پڑھا لکھا ہوگا۔ جتنا عام دیہاتی نوجوان پڑھ لکھ لیتے ہیں۔

آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟

ایسی کوئی خاص بات تو نہیں یہ، موچی کا بیٹا امریکہ کا صدر بن سکتا ہے تو کیا ایک دیہاتی نوجوان اعلی تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔

دوسرے شاید میں تمہیں آزما بھی رہا تھا کہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو کر تم میرے ساتھ کیا رویہ اپناتی ہو۔ وہ سادگی سے مسکرایا اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

آپ تو ہر طرح سے ایک اعلی انسان ہیں۔ پھر مجھے کیوں قبول کر لیا؟

کیون تم میں کیا کمی ہے۔ ہر طرح سے مکمل ہو۔ تم انتقام اور ریاکاری کی بھینٹ چڑھائی

گئیں۔ اگر چہ عورت کا یہ جرم نا قابل معافی ہوتا ہے مگر فیصلہ صادر کرتے وقت کوئی حکم لگاتے وقت انسان کا باطن بھی پڑھ لینا چاہیے۔ میں مرد ہوں مگر اس معاشرتی بیانصافی پر کڑھتا ہوں۔ وہ تباہ کاری میں تہائی حصہ دار ہوتا ہے۔ پھر تمام تر سزا عورت کے حصے میں کیوں آتی ہے۔ جب بابا نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے شادی کرلوں۔ تم ان کے دوست کی بیقصور بھانجی ہو۔ سچ سارا میرے دل نے اسی وقت انکار کر دیا تھا۔

میں بھی اور مردوں کی طرح برتی ہوئی جھوٹے برتن جیسی عورت اپنانے کا ظرف نہیں رکھتا۔ مگر مجھے یقین دلایا گیا تم اس ظلم کی حقدار نہیں ہو جو تم پر کیا جا رہا ہے۔ تم اب بھی بیلکیر آئینہ ہو۔

تمہیں ورغلانا چاہا تھا۔ ہارنے کی صورت وہ تمہارے لیے سراپا انتقام بن گیا۔

بابا نے مجھے یہ بھی کہا تھا۔ دنیا جو دیکھ رہی ہے سن رہی ہے اسی کو سچ کہے گی۔ ایک بیگناہ لڑکی خواہ مخواہ ماری جا رہی ہے۔

میں پھر بھی مشکوک تھا مگر میرے باپ کو مجھ سے زیادہ شاید اپنے دوست سے محبت تھی۔ اس نے میری ماں کی مخالفت کے باوجود اپنی بات ایک رکھی۔

میں تمہیں بد دلی سے بیاہ کر لایا تھا سارا۔

مگر اب احساس ہوتا۔ جاہل وہ نہیں جو ان پڑھ ہوتا ہے جاہل وہ ہے جو بغیر تحقیق کے بات جھٹلاتا ہے۔

میرا دل پھر بھی بیایمان رہا۔ جالانکہ تمہارے وجود میں سے میں نے سچائی بھی کھوج لی تھی۔

میں نے تمہارے ذہن پر دستک دی تھی۔ مرد بڑا خود غرض ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے پور پور روم روم دماغ کی لہر میں صرف خود کو چھایا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے سوچا وہ جو تمہیں اس مقام پر ڈال گیا۔ منظر سے ہٹ کر زمین پر قابض تو نہیں؟

میں شرمندگی کیساتھ یہ سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ مرد کی مخصوص فطرت ہے۔ جو بدلی نہیں جاسکتی۔ مرد اگر جہاندیدہ ہو تو ایک نظر میں عورت کو پڑھ لیتا ہے۔ میں نے پڑھ لیا تھا۔ اب آئندہ ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے سارا سنا۔

میری حوش نصیبی ہے کہ شہر کی پڑھی لکھی اور حسین لڑکی مجھے کتنیا رام سے مل گئی ورنہ اماں تو بیاہ لاتی کوئی ان پڑھ بھانجی بھتیجی۔ وہ مسکرایا۔

وہ پھر اس کے روکے سے نہیں رکی کاور عائشہ کیساتھ کپڑے دھلوانے لگی۔ جو نہر پر تختہ بچھا کر بری ترنگ میں کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ گھر واپس ہوئی تو اس کی شامت تیار کھڑی تھی۔

اری چلی گئی تتھی۔ خبر ہے مجھے تیرے چلتروں کی۔ نامراد تجھے تو عادت ہے مرد ذات کے پیچھے پھرنے کی۔ چار دن ہو بیاہی کو۔ آ گئے وہ تیرے لگے سگے ڈولی لے کر؟

عائشہ تو ماں کے غیظ میں دیکھ کر جھٹ یوسف کو بلانے بھاگ گئی تھی۔

اری بدجات مینی ہیرے جیسا چھورا۔ اور تو کیڑا لگا اناج۔

بڑی بی کا بس نہیں چل رہا تھا اس کا ٹینٹوا دبا دیں۔

وہ کھی؛ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ (آہ وقت کی چال)۔

اماں یوشف کی بھاری اور خشک اواز اس کی پشت سے ابھری تو وہ کانپ کر اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

کیا بات ہے اماں؟ کیوں اس پر گرمی کھا رہی ہو؟

ارے بڑی ہیر بنی پھر رہی ہے۔ اسے اپنی عجت کی پروا نہیں تو ہماری عجت تو کرے۔ ارے تیری بیوی ہے۔ سارے گاؤں میں ہماری عجت ہے کیا کہیں گے سب اگر اٹھا لے گئے اس کے۔

اماں یوسف کی آواز مارے جذب کے کانپ گئی۔

گلط نہیں کہہ رہی میں، تو کل کا چھورا تجھے تو کر لیا اس نے اپنے بس۔

بس اماں۔ اب اور کچھ نہیں میں لے گیا تھا اسے اپنے ساتھ اکیلی تھی گھر میں۔

ارے کیوں اپنی جان گنوا گا اس کوڑے پیچھے۔

اماں۔ میں کا سے لے کر چلا جاؤں گا یہاں سے۔

ارے لے جا اس دن رات کے کلیس کو، تیرے باپ نے تو مجھ سے خورے (خبر نہیں) کون سے جنم کا بدلہ لیا ہے۔ ایک سے ایک کناوری جھوری تجھے مل جاتی۔

یہ بھی کنواری ہی تھی۔ یوسف کی آواز شدت جذب سے لرزنے لگی تھی۔

ارے جا میرا منہ نہ کھلوا۔

اری تجھے جو بولا تھا۔ ناں کھیتن پہ نہیں جانا، بیاہ سے پہلے اٹھا لے جاتے تو اور بات تھی ارے کیا یہ بچائی ہوئی تھوڑی سی عجت ارے میں تو دے دوں گی تیرے گلے میں انگوٹھا۔ اگر اب کے باہر نکلی۔

یوسف اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے سامنے کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بھی مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے ہو لی۔

دیکھو سارا اماں پرانے وقتوں کی وہمی عورت ہے۔ اس کی باتوں کا حیال نہ کیا کرو۔ جو کچھ ہوا ہے وہ اسے اس سے بھی بڑھ کر سمجھتی ہے۔

گھٹی گھٹی سسکیاں اور رکے رکے آنسو بیاختیار ہو گئے۔

وہ اسے چند ثانیے ایک ٹک دیکھتا رہا پر اس کی چادر کے پلو سے اس کی رخسار پونچھ ڈالے۔

بابا اور غلام بخش (نوکر) رات تک آ جاغیں گے صبح میں چلا جاؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔ میں تو اماں کے سامنے پھر بھی بیبس ہو جاتا ہوں۔ لیکن بابا۔ بہت خیال رکھیں گے تمہارا۔ میں سارھے چھ بجے والی لاری سے لاہور چلا جاؤں گا تم اپنا خیال رکھنا۔ کوئی تمہارا کوئی نہیں بگاڑ سکتا۔

آپ چلے جائیں گے، مجھے اماں سے بہت ڈر لگتا ہے۔

میں نے کہاناں بابا۔ وہ تو تجھے بیاہ کر لا ہیں۔ بہت خیال رکھیں گے گھبرامت سارا خدا کے لیے۔ دسمبر میں مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں گا۔ میرے لیے دعا کیا کرنا۔ ڈرنے کی بات بھی کیا ہے تمہارے ماموں بھی اسی کاؤں میں ہیں۔

وہ اسے طفل تسلیاں دے کر باہر چلا گیا۔ وہ یہ سوچ کر رونے لگی۔ اب بری بی پھر شروع ہو جائیں گی۔ مگر شاید یوسف نے کچھ کہا تھا۔ رات تک خیر گزری اس نے بھی سوچ لیا وہ آج یوسف کے سامنے کوئی آزردہ بات نہیں کرے گی۔ اسے پریشان نہ کرے گی۔ صبح ساڑھے چھ بجے لاری سے اسے جلے جنا ہے۔

رات کو اس کے سسر آگئے تھے۔ داتا دربار سے لایا ہوا تبرک اس کے ہتھ میں دیا سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو اس کی دھارس بندھ گئی۔

تجھے یہاں کسی نے پریشان تو نہیں کیا؟ مجھے زیادہ دن لگ گئے لاہور میں۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہو سوچا۔ بابا میرا مقدر تو پگلی کے بالوں کی طرح پریشان ہے۔

مجھے شادابی صحن جمن سے خوف آتا ہے

یہی دن تھے کہ لٹ گئی تھی زندگی اپنی یوسف کے جانے کے بعد اس کا کام پہروں سوچنا رہ گیا تھا۔

اس اپنی خوبصورت اور مصروف مصروف سی ماں بیانتہا یاد آتی تھی۔ کاغذات کے پلندوں میں گھرا بیاندازہ سنجیدہ اور کم گو باپ۔ وہ جوانی کے منڈیروں سے جھانکتا۔ بڑا سنجیدہ کم چھوٹا بھائی سمیع اور اس سے چھوٹا بے انتہا شرارتی اور نٹ کھٹ سا وسیم وہ خوبصورت سی چھوٹی سی گڑیا جس نے نیا نیا اسکول جانا شروع کیا تھا۔

وہ بھی ان کے درمیان کبھی چہلیں کرتی پھرتی تھی اسے اپنگھر اور گھر والوں سے بیحد انسیت تھی۔ بڑی ہونے کے ناتے چھوٹے بہن بھائیوں کو ڈانٹتی ڈپٹتی امی کی ڈانٹ سن کر کام نبٹاتی۔ وہ کیسا خواب ساز زمانہ تھا۔ ہر وقت کھل کھلاتی رہتی تھی تفریح کی شوقین فلموں کا نوں کی رسیا۔ اس کا الہڑ پن اس کے روم روم سے چھلکتا تھا۔

وہ اسار نثار تھی۔ جس کی لاتعداد سہیلیاں تھیں۔ اسے نئے نئے فیشن لبھاتے تھے۔ اسے خوش رہنا آتا تھا۔ اور جو کہا کرتی تھی۔

میں دکھ کر انگلی سپکڑ کر اماں خورشیدہ کے دروازے پر چھوڑ آئی ہوں سنتے ہیں۔ اس کے دکھ کم نہیں ہوتے،

تب ساری سکھیاں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔ سب مجھ سے اس لیے بھی پیار کرتے تھے کہ اس کی شکل بھی پیار کے قابل تھی۔ اور اسے خوش رہنا اور خوش رکھنا آتا تھا۔

امی کی ڈانٹ پر اس نے کبھی برا منہ نہیں بنایا تھا۔ ڈھٹائی سے ہنستی رہتی تھی۔

ماں کو اس کی مسکراہٹوں سے بڑے وہم آتے تھے۔

خدایا اس کا مقدر ایسے ہی رکھنا ہنستا مسکراتا۔ بظاہر اسے دپٹتی تھیں۔

بیوقوف لڑکی ہر وقت نہیں ہسنا کرتے۔ لڑکیوں میں کچھ سنجیدگی بھی ہونا چاہیے۔

امی اسے کام بتا کر جاتیں وہ اوندھی پڑی نوٹس بنایا کرتی ان کی جان جل جاتی۔ کبھی ان کا موڈ آف ہو جاتا۔

چھٹی کے دن وہ پائینچے چڑھا کر پھر ایسے کام میں جت جاتی کہ انہیں ترس آنے لگتا۔

ارے فرش تو آمنہ دھو لے گی، تم مشین لگا لو کپڑے بہت جمع ہو گئے ہیں۔

فکر نہ کریں امی کپڑے بھی دھو لوں گی۔ بس ہفتے بھر میں ایک ہی دن کام کیا کرو۔

سسرال میں ایسے نہیں چلے گا۔ سب مجھ کو کہیں گے۔ اس کی بھی فکر نہ کریں میں انہیں ہفتے کو کلوروفام اس طرح سنگھا دیا کروں گی کہ اگلے جمعے تک پڑے سوتے رہیں جمعہ کی صبح کو اٹھ کر دیکھا کریں گے تو میں کام میں مصروف ملا کروں گی بڑے خوش ہوا کریں گے۔

بدتمیز۔ امی کو بیساختہ ہنسی آ جاتی۔

کوئی آیا گیا پوچھا کرے گا تو کہوں گی یہ پندرہویں صدی کے اصحاب کہف ہیں۔ جمعہ کی مبارک صبح اٹھ کر دنیا کے اتار چڑھاؤ ملاحظہ کرتے ہیں۔

امی کی ہنسی رو کے نہ رکتی۔

بہت وبان چلنے لگی ہے تیری۔

وہ اپنے اسی انداز میں سٹر پٹر پھر کرتی۔

لبوں کو لاکھ تبسم سے باز رکھ لیکن
تیری تو آنکھیں بہت مسکرانے والی ہیں

کالج جانے کے لیے صبح جب اسٹاپ پر کھڑی ہوتی تو اپنے دائیں بائیں کھڑے لوگوں کو دیکھ کر اسے گدگدیاں ہونے لگتیں بڑے برجستہ جملے ذہن میں کلبلاتے ان کی حرکتوں کا بغور مشاہدہ کرتی۔ کسی کا پان چبانے کا اسٹائل اس پر تیل چپڑے بالوں والا سر۔ دل ہی دل میں اس کے لیے کوئی نام سوجھ جاتا۔

کسی کا سڑک پار کرنے کا انداز دیکھ کر اسے مسکراہٹ دبانا مشکل ہو جاتی۔ کسی کا مطلوبہ بس دیکھ کر دیوانہ وار دوڑنا۔ اسے گویا گدگدیاں ہونے لگتیں۔

ماہر نقال کا تو اسے پہلے ہی خطاب مل چکا تھا۔ کالج پوائنٹ آنے تک وہ عمیق مشاہدے میں مصروف رہتی۔ اسٹاپ پر وہ اتنی بیخبر ہوتی کہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جب وہ دوسروں کے مشاہدے میں مصروف ہوتی ہے۔ تو کئی بغور اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

آپ کی گھڑی میں کیا ٹائم ہوا ہے؟

اس نے چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔ انتہائی کڑوی سی نظر ڈالی تھی۔

وہی جو ریڈیو پاکستان کی گھڑیوں میں ہوا ہوگا۔

مرا مطلب ہے میری گھڑی بند ہے۔

گھر سے چلا کر نکلا کریں۔ ویسے آٹھ بج کر پانچ منٹ ہو ہیں۔

اب اتنی بھی الھڑ نہیں تھی۔ مردوں سے اس کا رویہ محتاط ہی رہتا تھا۔ یہ اسکی ماں کی تربیت کا خاص حصہ تھا۔

پوائنٹ آنے پر وہ لپک کر اس میں چڑھ گئی۔

ریسز میں اس نے سکھیوں کے بیچ میں بیٹھ کر آج کے تازہ مشاہدات بیان فرما۔ ٹائم پوچھنے والی بات ہنس ہنس کر بتائی۔

ایسا جواب دیا موصوف کو بغلیں جھانکنے لگے تھے۔

لڑکیوں سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈے ہیں۔ صبا نے ٹکڑا لگایا۔

اور اس سے تو خاص طور پر ڈھونڈتے ہوں گے۔ آسیہ نے اس کے صبیح چہرے کو رشک سے دیکھا۔

اچھا تم زیادہ مت بنایا کرو۔ اس نے فائل اٹھا کر اس کی کمر پر رسید کی۔

کیا ملے گا تجھے بکھرے ہو ہو خوابوں کے سوا
ریت پر چاند کی تصویر بنانے والے

وہ حسب عادت سب کے مشاہدے میں مصروف تھی۔ ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہو اس کی نظر اسٹاپ پر لگے درخت سے ٹیک لگا اس شخص کی سمت گئی بیحد پر شوق نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ جانے کیسی نظر تھی۔ جو اس کے اعصاب سلاگئی حاضر دماغی کو مات دے گئی۔

ہونہہ بن ٹھن کر ایسے نکلتے ہیں جیسے کہیں کے لارڈ ہوں اور سوٹ پہن کر بسوں میں دھکے کھاتے ہس۔ اسے بروقت یہی تبصرہ سوجھا۔

اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ براؤن بش شرٹ جس کا میرون کالر اور اسی رنگ کی آستینوں پر لگی پٹی پھر اس میں سے برآمد ہوتے ہو دودھیا بازو سفید شلوار سفید دوپٹہ جو وہ پیشانی تک منڈھ لیتی تھی۔ دوپٹے کی حد سے باہر اس کا گلابی شوخ و شریر خیالات کا عکاس چہرہ کسی کو پاگل بنانے کے لیے کافی تھا۔

اس نے پوائنٹ رکتا دیھک کر تیز یسیقدم بڑھا دیے اسی دم وہ بھی ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ چکا تھا۔ کالج پہنچنے کے بعد حسب دستور وہ سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔

آج اس نے سہیلیوں کے سامنے اس واقعہ کو گول کر دیا وہ کون سا شوخی میں اس سے کم تھیں تنگ کر کرے رکھ دیتی تھین۔

اگلی صبح اس نے شعوری طور پر دائیں بائیں دیکھا۔ دیر ہو گئی تھی۔ بس نکل چکی تھی۔ اسے رکشے وغیرہ سے جانا تھا۔ پاپا اس سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ ورنہ وہی چھوڑتے ہو چلے جاتے جانے کیوں اس کا دل دھڑک گیا وہ بڑے اطمینان سے کش لگا رہا تھا۔ روز کی طرح ویل ڈریس اور اس سے کتنا قریب کھڑا تھا۔ وہ اس کی خوشبو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

بس اسٹاپ سنسان ہو چکا تھا۔ سامنے روڈ پر البتہ کچھ لوگ آ جا رہے تھے لوگوں کے کام پر روانہ ہونے کا وقت صبح ہی صبح ہوتا ہے۔

معاف کیجیے گا مس۔

اس کی سمت دیکھ۔۔ اسے دو بھر لگا۔

یہ کتاب اس بینچ پر پڑی ہوتی تھی کل۔ اس نے ایک طرف لگے بینچ کی سمت اشارہ کیا۔

غالباً آپ کی یا آپ کے ساتھ جانے والی کسی لڑکی کی ہے۔ کتاب اہم بھی ہے اور قیمتی بھی ہے۔ اس نے کتاب کی سمت دیکھا بایوکیمسٹری کی ضخیم کتاب تھی،

یہ میری نہیں ہے۔ اس نے سرد مہری سے کہا۔

اس پر نام لکھا ہے آپ کی کسی ساتھی طالبہ کی ہو سکتی ہے۔

لیجیے بھئی جس کی بھی ہو دے دیجیے گا۔ عجیب قطعی سا انداز تھا اس نے کتاب تھام لی وہ فوراً اس کے پاس سے ہٹ گیا۔

اسی روٹ کی ویگن جو کالج کی سمت جاتی تھی آ کر رکی تو وہ لپک کر چڑھ گئی۔

باہر کی سمت اس نے نہیں دیکھا پھر۔

کلاس میں سیٹ پر بیٹھ کر اس نے کتاب کھول کر دیکھنا چاہا اندر سفید لفافہ تھا۔ جس پر سرخ روشنائی سے لکھا تھا۔

آپ کے لیے۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔

دل دھڑکا تھا بڑے زور سے یہ اس کے ساتھ بڑا اچھوتا اور تہلا واقعہ تھا۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

کیا بات ہے سارا۔ میڈم کی آواز میں تشویش تھی۔

تھنگ میڈم۔ وہ خفیف سی ہو گئی اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سب سے اگلی رو میں ہے۔ یہ اگلی سیٹ اس کی سکھی اس کے لیے گھیر کر رکھتی تھی۔

اس دن وہ اس قدر گم صم رہی کہ پورے گروپ کو اس کی طبیعت و صحت کے متعلق تشویش ہو گئی۔ اس کا ذہن اسی سفید لفافے میں اٹکا ہوا تھا۔ اس میں کیا ہے۔؟

پڑھوں کا بنا پڑھے پھاڑ دوں۔ تمام دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔

رات کو وہ اپنے کمرے میں آئی دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا۔ اس کے مومی ہاتھوں میں لرزش تھی۔ اندر سے سادہ سے سفید ہی کاغذ پر سیاہ روشنائی میں کچھ رقم تھا۔ بسم اللہ یوں تھی۔

سب تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے اس خوبصورت کائنات اور آپ کو بھی بنایا۔

پرنس

تمام نیک تمنائیں فقط آپ کے لئے۔

کہنا بہت کچھ ہے۔ سمجھ کچھ نہیں آ رہا۔ سوچتا ہوں گاڑی خراب ہونا میرے لیے مسعود ہی ٹھہرا دو دن گاڑی ورکشاپ میں رہی تیسرے دن آ گئی تھی۔ اس کے باوجود میں ٹیکسی سے گیا۔ اس لیے کہ بنا بات کیے کیسے رہ جاتا؟ جو مجھ پر گزرتی ہے اس کا اندازہ آپ کر ہی نہیں سکتیں۔

آج اگر آپ تک اپنے جذبات پہنانے میں کامیاب ہو گیا۔ تو بہت سا بوجھ سینے سے سرک جاگا۔ المختصر آپ کو گنوانا نہیں چاہتا۔

اگر خدا اتنا حسین روپ دے تو نقاب لگا کر نکلتے ہیں۔ یوں پاگل نہیں بناتے پھرتے۔

سمجھیں؟ اگرچہ بہت عامیانہ حرکت ہے۔

اگر آپ کا گھر دیکھنے کے لیے آپ کا تعاقب کرتا تو ذلیل ہونے کا بھی خطرہ تھا۔ بہرحال معزز آدمی ہوں۔ فقط اعتماد اور اس نظر کا طالب جس کے لیے شاہ تخت گنوا دیتے ہیں۔

منوچہ آفتاب

یہ تحریر تھی یا ایٹم بم اتنی شستہ اردو میں خط اتنا خوبصورت نام اس نے پہلی بار پڑھا تھا۔ اس نے خط مٹھی میں بھینچ لیا۔ خوف اور شرم سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔

کیا کروں اس کا۔ اس نے خط کی سمت دیکھا۔

پھر دروازہ کھول کر باہر آئی کچن میں جا کر اس نے خط جلا دیا گویا اپنی حفاظت کر لی۔ اب وہ بخوفی سے سو سکتی تھی۔ پر نیند کہاں؟

شجر کو سبز دیکھ کر یہ الجھن ہے
کہاں یہ رنگ نمو کہاں پہ زہر کا رنگ

وہ بیحد محتاط ہو کر چلنے لگی تھی اسٹاپ پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اگر کوئی کار اس کے نزدیک دھچکے سے رکتی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا۔

جوانی محتاط نہیں ہوتی۔ ڈر اور خوف میں تو تربیتیں بولتی ہیں۔ اس عمر میں سب ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی یہ کتاب سب پر الہام ہوتی ہے۔ یہ کتاب کھلی اور بیباک ہوتی ہے۔ سب اسے حجاب کے بند کواڑ کے پیذجے پڑھتے ہیں۔ بچے کو پانچوں چھیئیوں کلمے سکھا جاتے ہیں۔ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے بولنے چالنے کے آداب سکھا جاتے ہیں۔ سکھانے والا سکھاتا ہے وہ سیکھتا ہے۔ ایک حد تک اکتساب کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک دن اسے سوجوں کے بیچ ایک نیا رستہ دکھتا ہے۔ اسی دن سے یہ عام اور خوبصورت اور بیحجاب کتاب الہام ہوتی ہے۔ کھلا کھلا سمجھانے والے مبہم انداز میں سمجھانے لگتے ہیں۔ حد بندیاں باندھنے لگتے ہیں۔ جو طبیعت کو ناگوار گزرنے لگتی ہیں۔ اسے بھی امی کے اعتراضات بیجا لگنے لگے تھے۔ ان کی فہمائش پر منہ پھول جاتا اس کا جی چاہتا کہ جو اسکا دل کہہ رہا ہے اسے کرنے دیا جا۔

اس کی ماں محتاط اور حساس تھی۔ اسے احساس تھا اسکی بیٹی کا حسن و شباب غیر معمولی ہے۔ جسے اس کی بے نیازی نے دوآتشہ کر دیا ہے۔

بڑی دور تک ماں کی تربیت اسے پکڑنے آئی۔ مگر تربیت سے زیادہ وقت کی اڑان تیز تھی شاید۔ کافی کوس ماں کی نصیحتیں اسے گھیرنے آئیں۔ جنہیں اس نے کار کے چار پہئیوں کے نیچے کچل دیا۔

اس نیا یک دن اسے واپسی میں جا لیا تھا۔ اور ایک رول کیلنڈر دے کر کار آگے بڑھا دی تھی۔

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سب بڑی تیزی سے آ جا رہے تھے۔

پھر ویسی ہی گرم رات چکر کھا کر آئی۔

اس نے پھر کمرہ بند کیا۔

کیلنڈر کھولا چار پانچ صفحات پر مبنی کیلنڈر تھا۔ وہ صفحے الٹنے لگی۔

سینوی کے دوسری جانب سیاہ روشنائی سے تحریر تھا

شروع اس خدا کے نام سے جس کے روبرو آج کل میری پلکیں دعاؤں سے نم رہتی ہیں

پرنس خدا تمہیں اس سے بھی زیادہ توفیق دے جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کیساتھ ایسا ہوا تم لوگوں کے دل ہمیشہ پتھر کہے گئے۔ اور یہ غلط بھی نہیں۔

تم مجھے عام سا لوفر سا آدمی سمجھ رہی ہو گی۔ مگر تم انجان ہو آخر تم تک آنے کا کوئی رستہ بھی تو ہو۔

میں ایک معزز آدمی ہوں لیکن تمہاری خاطر کتنی نیچی سطح پر آ گیا ہوں۔ میں چوراہے پر گاڑی میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم نہ آئیں تو میں کبھی تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا۔ اور آئندہ شاید برسوں بعد سینی ٹوریم سے مخاطب ہوں۔ اپنی سچائی دکھانے کے لیے کہ تم بے داغ ہو جو مجھے کینسر کی طرح زچ کرے گا۔ بنانے والا تمہیں میرے خاندان میں بھی تو بنا سکتا تھا۔

یوں راہوں میں تمہاری جھلک دکھا کر غالبا اس نے میری قسمت میں خوار ہونا لکھا ہے

منوچہر آفتاب

اس نے کیلنڈر کا وہ صفحہ نکالا اور ڈسٹ بن میں جلایا۔ دیر تک جلتے شعلوں کو دیکھتی رہی۔

ان شعلوں تربیت جل رہی تھی۔ اکتساب بھی پھنک رہا تھا۔

وہ اس کچی عمر کی لڑکی میں وہ جذبہ بیدار کر چکا تھا۔ جو عورت کو بہتا لاوا بنا دیتا ہے۔ جو عورت کو نابینا کر دیتا ہے۔ بادشاہ سے بیوفائی کی جرات دیتا ہے۔ جس پر گل صنوبر میں بیوفا ملکہ کو اس کے محبوب کے سر سے کیڑے جھاڑ کر اس میں کھانا شامل کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ کسی کی جائیدان نہیں تھی۔ مگر وہی جذبہ خود کر آ چکا تھا۔ جس نے ملکہ کو آگ پر چلنے کا حوصلہ دیا تھا۔

ایک مقتدر شخص سے بیوفائی کی جرات دی تھی۔ وہی جو گل صنوبر میں ملکہ نے بادشاہ کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے ماں باپ کیساتھ کرنے کی ٹھان لی۔

اس نے مصمم ارادہ کر لیا وہ چوراہے کی سمت ضرور جا گی۔ وہ اسے نہیں گنوا گی۔

اہل طلب مال وفا اجنبی سہی
لگتا ہے صرف شوق کا آغاز آشنا

ہرا یرے غیرے کے لیے ایک لڑکی میں یہ جراتیں نہیں آتیں بہترین سوٹ ہیرے کے کف لنکس آنکھوں پر نہایت قیمتی گلاسز پھر بہترین ہنڈا سوک موٹر کار۔ سب سے بڑھ کر انتہائی گریس فل اور ہینڈسم اور کوئی کھلنڈرا نوجوان بھی نہیں تھا۔ تیس کے پیٹے میں تو ہو گا ہی۔ اس کے دل میں تو اس احساس نے گدگدیاں پیدا کر دی تھیں کہ وہ اس کی خاطر اس طرح پریشان پھرتا ہے۔ اس قدر صاحب حیثیت اور گریس فل شخص۔ دونوں خط اس کے بھرپور جذبات کے عکاس تھے۔

اس نے مردہ قدموں سے آتی ہوئی سارا کو دیکھ لیا تھا۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

بات سنیں۔ مم میں صرف یہ کہنے آئی ہوں۔ جو کچھ آپ کر رہے ہیں۔ میرے حق میں اچھا نہیں ہے۔ میں نظروں میں آ سکتی ہوں۔ اس کے صبیح رخسار دہک اٹھے تھے۔ نظریں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ یہ واقعتاً اس نے دل کی بات بولی تھی۔

مجھ پر اعتماد کرو۔ گمنام لڑکی۔ بلکہ پرنس۔

اف۔ سینے کے اندر دل کی علیحدہ اچھل کود جاری ہوگئی۔

پلیز مجھیوں تماشا نہ بناؤ۔ اس نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نن۔ نہیں میں گاڑی میں نہیں بیٹھوں گی۔

تو پھر میں تمہارے ساتھ پیدل ہی چلتا ہوں۔ اگر تمہیں کار میں بیٹھنا پسند نہیں۔ لوگ ہماری سمت متوجہ ہو رہے ہیں۔ اس نے دیکھا واقعی کچھ لوگ کھڑے ہو کر معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے تو چھکے چھوٹ گئے۔

وہ جلدی سی اندر بیٹھ گئی اور زور سے دروازہ بند کیا مبادا لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے ساتھ وبردستی کی جا رہی ہے۔ الٹے لینے کے دینے پڑ جائیں۔

وہ فورا بیٹھ گئی تھی۔ مگر اب اندرونی صورتحال سے بوکھلا بھی رہی تھی۔ دہشت بھی تھی۔ حالانکہ دل کو جانے کیون اس اجنبی شخص پر اعتماد سا ہو چکا تھا۔

وہ کتابوں کی سمت نظریں کیے رہی۔

جیسا کہ تعارف ہو چکا ہے میرا۔ کہ مجھے منوجہر کہتے ہیں۔ میکینیکل انجینئر ہوں وہ بھی ضرورت کے تحت نہیں محض اپنی شناخت کے لیے میرے اباؤ اجداد کا تعلق۔ مشہور امراء و نوابین سے ہے۔ اسے عامیانہ پن نہ سمجھیے گا۔ بلکہ تعارف ہی کا ایک حصہ سمجھیے۔ دراصل خاندانی پس منظر ایک بہت اہم چیز ہوتی ہے۔

وہ دھیمے دھیمے بول رہا تھا۔ بھاری اور جذبات کو گرماتی ہوئی آواز۔

بعض اوقات چیز ساری دنیا جھان مارنے کے باوجود نہیں مل پاتی بعض اوقات بس اسٹاپ پر مل جاتی ہے۔

اس کی طبع نازک پر اس کا جملہ ناگوار گزرا۔

میں چیز نہیں ہوں۔ یہ وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

جانتا ہوں۔ وہ گویا اس کی تنتنائی ہوئی ادا پر مرمٹا۔

اتنی دیر میں اس نے ایک بار بھی منوچہر کی سمت نہیں دیکھا تھا۔ بات بزدلی اور کم ہمتی کی نہیں نظروں کی گرمی کی تھی۔ جو اس کی برداشت سے باہر تھی۔

میں تم سے تمہارا تعارف چاہوں گا۔ چا پینے اور کھانا کھانے کے لیے کہوں گا تو شاید تم اس پر برا مانو۔

نام نہیں بتاؤ گی؟ سارا انشار۔ وہ مختصرا بولی۔

والدین بھی ہیں الحمدللہ۔ دو بہنیں دو بھائی۔

بھائی بڑے ہیں؟

نہیں۔

یہ کون سیا یریا میں ہو۔؟

اسے یہ بات بہت کھل رہی تھی کہ وہ چھوٹتے ہی تم سے بولا تھا اور مسلسل بول رہا تھا جیسے اس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ اور وہ شاید اس لیے کر رہا تھا کہ عمروں کے درمیان کافی تفاوت تھا۔

بتایا نہیں کس ایریا میں ہو؟

تھرڈ ایرا اسٹارٹ ہے؟

کم بولتی ہو؟

اس نے منوچہر کی سمت دیکھا۔ وہ پوری طرح سامنے متوجہ تھا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں نے اسٹیرنگ تھام رکھا تھا۔ ہاتھوں کی بناوٹ و چہرے کی شفاف جلد سے اسکی خوشحالی اور فارغ وقتی کا پتہ مل رہا تھا۔

اس کے لب بھینچے ہوئے اور تیز گلابی تھے۔ بالائی لب تو مونچھوں سے آدھا ڈھک چکا تھا۔ آنکھیں گھور سیاہ اور ہیرے کی کنی کی طرح چمک رہی تھیں۔ سارے سراپے میں اسے اس کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی غیر معمولی محسوس ہوئیں۔

اسے قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس سے پہلی مرتبہ اتنا قریب ہوئی ہے۔ یا اس سے پہلی مرتبہ تعارف ہوا ہے۔ رتی برابر اجنبیت اسے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ چھوٹتے ہی ایسے بولا گویا کوئی بہت پرانا تعارف ہو۔

میں صرف اسٹاپ جانتا ہوں۔ گھر کس سمت ہے؟

اوہ۔ وہ چونک پڑی۔ وہ اسے اس کے اسٹاپ تک بھی لے آیا تھا۔

نہیں شکریہ۔ بس یہیں۔ گھر اتنے قریب دیکھ کر سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔

تھینک یو سو مچ۔ ڈار پرنس۔ آدھا لفظ کھا کر جھٹ پرنس کہا۔ وہ اپنی دھن میں تھی نہ اس نے ڈار سناہ پرنس۔

اس سے ملے تو زعم تکلم کے باوجود
جو سوچ کر گئے تھے وہی اکثر نہیں کہا

سارا۔ سنو آج ایسا کرو چھٹی کر لو۔

امی آج تو میرا پریکٹیکل ہے۔ وہ گھبرا کر بولی۔

پریکٹیکل تو تمہارے روز ہوتی ہے۔ وہ کچن میں جاتے ہو بولیں۔

لیکن امی آج تو بہت اہم پریکٹیکل ہے۔ سچ میڈم بہت ڈانٹتی ہیں۔

بھئی۔ دنیا کو بیٹیوں سے کس قدر آرام ہوتا ہے۔ مگر تم کبھی وقت پر کام نہیں آئیں۔

وہ ہلکی سے خفگی سے بولیں۔ آپا جان سپر سے آ رہی ہین۔ دوپہر کے کھانے پر اہتمام ہوگا۔

شام کو کر لیں گے۔ امی۔ وہ دلار سے بولی۔ میری اچھی امی پلیز۔

ہاں بس اتر آؤ خوشامدوں پر۔ اچھا بابا جاؤ۔ کرلوں گی میں خود میں تو اس خیال سے اور بھی۔ خیر جاؤ۔

وہ ماں کا نارمل موڈ دیکھ کر خوش خوش تیار ہوکر اسٹاپ کی طرف چل دی۔

آخری بلاک کے بعد وہ مڑی تو دل بڑے زور سے دھڑکا اس کی خوبصورت کار اسٹاپ سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔ فرنٹ ڈور کھولے سر جھکا وہ پائپ میں تمباکو کو بھر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ واپس ہولے۔ جانے کیوں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ضمیر کل کی خجالت پر برافروختہ تھا۔ شاید شریف خون اتنی آسانی سے اپنا باطن ختم نہیں کرپاتا۔

اس کی چال سست ہوگئی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ وہ اس لاجواب شے کو نظر اٹھا کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکے گی۔ اور جب وہ اس کی سمت دیکھے گی۔ تو ڈھے جاگی۔ پھر اس کی سوچ کے ہر دروازے پر قفل پڑ جائیں گے۔

اس نے دیکھا تھا۔

اور اس نے پائپ منہ سے نکال کر نظر سے روک لیا تھا۔ وہ انگارہ انگارہ چلتی فرنٹ سیٹ پر تھی۔

اس نے دروازہ پورا کھول دیا تھا۔ اس کا انداز حتمی تھا وہ بیٹھ گئی۔

اس نے اس گریس فل آدمی کے چوری سے دیکھا جو اپنی خوبصورت اور بولتی پکارتی آنکھوں پر گلاسز چڑھا چکا تھا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ کل کی مختصر ملاقات اس قدر تشنگی دے گی کہ۔ سر راہ چلنے والے کبھی اتنے اچھے بھی لگا کرتے ہیں۔

اس کی آواز آنچ دے رہی تھی وہ قطرہ قطرہ پگھلنے لگی۔

میں کئی برس یورپ میں گزار چکا ہوں۔ میری ڈھیروں کزنز کولیگز ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوگیا ہے۔

اور وہاں تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔

میں چاہتا ہوں تم مجھ سے واقف ہوجاؤ۔ تاکہ میں تمہیں تمہارے والدین۔۔۔۔۔۔ سے مانگوں اور وہ بھی انکار کرنا چاہیں تو تم میرا ساتھ دو۔

تم محض میری پسند نہیں ہو۔ سب کچھ ہو۔

وہ کھلنڈری لڑکی اندر کے طوفان کو دبانے لگی۔

تم کچھ نہیں بولو گی؟

کیا بولوں؟ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

کچھ بھی سہی۔ کہنا تو چاہیے ناں۔ میرے متعلق۔

میں آپ کی کار میں بیٹھی ہوں۔ یہ کافی نہیں ہے۔

اعتبار ہے ناں مجھ پر۔؟ انشائاللہ یہ قائم رہے گی۔ سنو آج کا دن مجھے دے دو۔

تمام دن۔؟ وہ گھبرائی۔

تمام دن۔ اس نے موڑ کاٹا۔ میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

وہ۔ میری امی۔ اس نے ہکلاتے ہو کچھ کہنا چاہا۔

اس کی آنکھوں کے تاثرات پر سیاہ پردے تھے۔ لیکن ہونٹوں پر بیساختہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ پھر گڑبڑا سی گئی۔ پندرہ برس کی تھی جب میٹرک کیا تھا۔ سترہواں ختم ہوا تو انٹر بھی کرلیا۔ بی۔ ایس۔ سی کا پہلا سال تھا اور اٹھارویں کا آغاز۔ عقل تو عمر کے حساب سے جو تھی سو تھی اس پر کرتا دھرتا ماں کے ہوتے ہو غیر ذمہ داری کا اندازہ وہ کم از کم بھی تیس کے لپیٹے میں ہوگا۔

اس نے شاید ایسے ہی باوقار مرد ساتھی کی غیر لاشعوری آرزو کی تھی۔ ورنہ لڑکے تو بہت تھے خاندان میں بھی اور خاندان سے باہر بھی مگر اس طرح کے احساسات سے وہ کبھی دوچار نہ ہوئی تھی۔

اندر کا انسان باہر کے انسان سے بہت آگے ہوتا ہے۔ اندر فیصلے ہوجاتے ہیں۔ لاشعور کے زینے پھلانگ کر دماغ میں پختہ خیال بننے تک کوئی سفر ہوجاتا ہے۔ شاید اس کے اندر نے فیصلہ کرلیا تھا۔ طلب کی پہچان کرلی تھی۔ وہ تین دن اسٹاپ پر آیا تھا تین میں اس باطن نے تیزی سے سفر کرکے اس کے شعور کو پختہ کردیا تھا۔ یہ ہر انسان جس عمر میں ہوتا ہے اپنے شعور کو پختہ سمجھتا ہے۔

وہ سوچ چکی تھی۔ کہ جو اس کے سامنے آیا ہے۔ دوبارہ نہیں آ گا۔ وہ ملالی میں زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے خوش رہنا اچھا لگتا تھا۔

اس نے جان تو نہیں مانگی تھی۔ دن مانگا تھا اور شاید دل بھی۔

اس نے دے دیا۔ کہ دن محض اس کی جائیداد نہیں تھا۔ محض چشمہ تھا۔ اس چشمے کو۔ فیض کا چشمہ بنادیا۔

اس کے پیچھے اس قسم کی کوئی روایت نہیں تھی۔

روایت انسان ہی بناتے ہیں۔

اس نے بنادی۔

میں اتروں گی نہیں۔ کوئی دیکھ لے گا۔ کتنے روایتی خوف اس نے دودھ میں پیے تھے۔

یہ ساحل ہے۔ لوگوں کی بھیڑ ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم میں انڈر اسٹینڈنگ ہوجا لوگ ایسے ایسے گھناؤنے کام محبت کے نام پر کرتے ہیں کہ یہ لفظ اپنی حقیقت کھو بیٹھا ہے۔ جو چیز میں تمہارے لیے اپنے دل میں محسوس کرنے لگا ہوں۔ اس کا نام کچھ اور رکھوں گا۔ چلو ریت پر ٹہلتے ہیں۔ آؤ پلیز۔

اف یہ انسان ہے یا۔ وہ حواس کھو بیٹھی۔ وہ اس کی سوچ سے بڑھ کر تھا۔

وہ اسے نہیں گنوا گی۔

رات وہ شخص میرے خواب میں تھا
عکس جس کا ہر اک گلاب میں تھا

جب وہ گنذر میں داخل ہوئی تو ساڑھے تین بج چکے تھے۔ گھر میں داخل ہو کر تو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ہر ایک اس کو نظروں سے ٹٹول رہا ہے۔

بتایا تھا تمہیں کہ آپا جان آ رہی ہے۔ پھر بھی دیر سے آئی و۔ امی نے ہلکی سے خفگی کا اظہار کیا۔

وہ خاموشی سے شوز اتار کر جرابیں کھینچنے لگی تھی۔

اور وہاں۔ یہ بے پروائی اور بدسلیقگی آپا جان کو نہ دکھانا ذرا طریقے سے رہنا۔

آج وہ جرم کے جوہڑ سے پائنچے چڑھا کر نکل آئی تھی۔ ماں کے سامنے خاموش رہی ورنہ دل تو بہت چاہا تھا کہ پوچھے۔

ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں آپا جان میں یعنی ہماری خالہ جان میں۔

وہ اٹھی خاموشی سے کپڑے بدلے کھانا کھایا۔ امی نے بتایا تھا کہ خالہ جان کھانا کھا کر نماز ظہر کے بعد قیلولہ فرمانے اوپر جا چکی ہیں۔

اس نے تو شکر ہی ادا کیا خود بھی تھوڑا سا کھا کر سو گئی۔ تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں کیونکہ اسے دوپہر کو سونے کی عادت تھی۔

پانچ بجے کے قریب سمیع نے اس کے تاریک کمرے میں آ کر لائٹ جلائی تھی۔

آپا اٹھو ناں خالہ جان کہہ رہی ہیں۔ بہت سوتی ہے یہ لڑکی۔ امی کا تو سخت موڈ خراب ہے۔ مجھے بھیجا ہے کہ اٹھا دوں۔

ہاں سوتے رہتے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اف خدایا انگلیون پر ورم آ گیا ہے چلتے چلتے نئے جوتے بہت تنگ کرتے ہیں۔ اس کی نظر اپنے دودھیا پیروں کی انگلوں پر گئی۔

کیوں کیا آج کالج میں کرکٹ میچ تھا؟

نہیں بھئی۔ وہ پاؤں ہلکے ہلکے دبا کر بولی۔

اچھا میں سمجھا تھا سب سے زیادہ رنز آپ نے بنا ہیں۔ جلدی سے اتر آئیں اب بستر سے۔

وہ دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر سستی سے چلتی ہوئی باہر آئی کچن کے سامنے ہی کرسی ڈالے خالہ جان امی جان سے باتوں میں مصروف گفتگو تھیں۔ اسے دیکھتے ہی چونک گئیں۔

السلام علیکم۔

وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔ ارے ماشائاللہ کیا قد نکالا ہے۔

ارے ساجدہ۔ ماشائاللہ۔ بیٹی تو بس تمہاری ہی نکلی ہے ایک۔ انہوں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور اس کی پیشانی چوم لی۔

ہاں۔ بس آپا جان۔ آپ اور اس کا دماغ خراب کر دیں۔

امی نے بیٹی کے بیحد حسین جہرے کی سمت دیکھا اور دل ہی دل میں ماشائاللہ کہا۔

منہ ہاتھ دھو کر اس نے ماں کے ساتھ مل کر کھانا پیار کیا۔ اپنی مخصوص نفاست اور پھرتی

سے۔ ان کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ انہیں یہ دھڑکا تھا کہ بہن ان کی بیٹی کو بدسلیقہ نہ سمجھ لیں۔ آخر اکلوتے لائق فائق بیٹے کی ماں تھیں۔ ساری زندگی بہن سے بنی تھی۔ وہ ساجدہ کے لیے خصوصی وسیع دامن رکھتی تھیں۔ کچھ عمروں میں تفاوت کچھ ساجدہ کا ان کے لیے ادب واحترام ان سے زیادہ سارا کو کون عزیز رکھ سکتا تھا۔ ان کی معصوم اور چاند چہرہ بیٹی جس کے لیے وہ بظاہر بہت سخت تھیں لیکن شاید سب سے زیادہ اس کے لئے اپنے دل کو نرم پاتی تھیں۔

خالہ جان کے حد درجہ التفات سے اسے وحشت ہونے لگی تھی۔

منصور تو مجھے عرصے سے ٹال رہا ہے۔ کچھ ہو جاؤں۔ بن جاؤں۔ خدا نے اٹھائیس برس پہلے بنا کر بھیجا تھا۔ اب کیا بنا کس چیز کی کمی ہے؟

وہ دور دور پھرتی سارا پر سو سو جان سے نثار ہوتی رہیں۔ رات پھر آئی وہ دبے پاؤں چھت پر چڑھی تھی۔ اس سے پہلے کبھی چاندنی کی خوبصورتی محسوس نہ ہوئی تھی۔ صرف سر میں قلم چلا چلا کر نوٹس بنانا اور پڑھنا آتا تھا یا پھر امی کی ڈانٹ کھا کر ہنسنا آتا تھا۔ یا پھر تارا کا خوبصورت کا ہیئر اسٹائل بنانا اس کو خوبصورت فراکیں پہنا کر اسے ہر زاویے سے دیکھا کرتی اور چوم چوم کر اس کے رخسار سرخ کر دیتی۔

اور اب تو تارا نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ صبح ہی صبح وہ اس کی دو چھوٹی چھوٹی پونی ٹیلز بناتی۔ صاف ستھرا یونیفارم پہناتی۔ صاف اور چمکتے سیاہ جوتے، پاپا اسے چھوڑتے ہو جاتے تھے۔ تارا کی انگلی تھام کر وہ باقاعدہ گاڑی تک لاتی تھی۔ رات کو اس کا ہوم ورک چیک

کرتی تھی۔

اج اس نے تارا کا یونیفارم بھی نہیں دیکھا نہ ہی اس کا ہوم ورک چیک کیا۔ ابھی وہ یونہی گیٹ تک آئی تھی۔ چاند کو اس نے پام سے جھانکتے دیکھا تھا۔

اسے محسوس ہوا چاندنی خاص چیز ہے خاص لمحوں کی ٹھنڈی چھایا۔

وہ دیوانگی جو انسان کو نشہ سا دیتی ہے۔ اس دیوانگی کو چاندنی اور بڑھا دیتی ہے۔

وہ دبے پاؤں اندر آئی تھی۔

اس کا جی چاہا تھا وہ چاندنی کی سمت اپنے تخیل کو پرواز کرے اور چاند میں۔ منوچہر آفتاب کو دیکھے۔ وہ انسان جو دوسرے لوگوں سے کس درجہ ممتاز تھا۔

کس قدر پراسرار اور بیحد گریس فل۔

اس نے فون نمبر تو دے دیا تھا لیکن منع کر دیا تھا۔ وہ اس کو ورق ورق پڑھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ اس سے فون پر کچھ بھی نہ کہہ سکے گی وہ اسے کیسا لگتا ہے۔ وہ کے بارے میں کیا سوچتی ہے لکھ کر کہہ دے گی۔ وہ اس کی بات مان بھی گیا تھا۔

اب وہ سوچنے آئی تھی کہ اسے کیا لکھے۔

اس کو نہیں معلوم تھا ان راستوں پر چلنے والوں کو غیب سے مضامین آتے ہیں۔ محبت نامے میں بعض اوقات وہ الفاظ بھی آ جاتے ہیں۔ جو کسی لغت میں بھی نظر نہیں آتے۔ مگر ماورائی جذبوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ وہ دیر تک منڈیر پر کہنیاں ٹکا سامنے گھورتی رہی۔

سوچتی رہی۔

پھر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پاپا کا رائٹنگ پیڈ اٹھا کر لکھنا شروع کیا۔

منوچہر آفتاب

آداب

سچ اپ نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ یہی کہ آپ کی باتیں سب سے الگ ہیں۔ آپ میں گریس ہے۔ آپ میں ڈگنیٹی ہے۔ جب آپ پہلی بار میری راہ میں آ تو میں نے حیران ہو کر سوچا کہ یہ شخص ظاہری طور پر تو کوئی کھلنڈرا و بینیاز لڑکا نہیں لگتا۔ لیکن حرکت۔ آپ کا کہنا بھی بجا۔ اگر یوں بہانے نہ کرتے تو سرا ہاتھ کیسے آتا۔ میں نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا، قلم یہ سوچ کر بھی اٹھایا ہے کہ آپ کو بتادوں میں ایک گرل فرینڈ کا کردار ادا نہیں کرسکتی، آپ کا ساتھ چاہیے مگر قانونی۔ آپ مجھے سیر سپاٹے کی شوقین لڑکی مت سمجھیے، اپنے والدین کو سیڑھی بنا لیجیے۔ اور مجھے آئندہ کبھی باہر ملنے کو نہ کہیے گا۔ اس دن اگر میں آپ کی بات نہ مانتی تو تماشا بن جاتی سب کے سامنے کسی کے ساتھ زبردستی کرنا اچھی بات نہیں

ہے۔ سمجھ رہے ہیں ناں آپ؟ رات کا ایک بج رہا ہے ٹوٹ کر نیند آنے لگی ہے خدا حافظ

سارا

اس نے خط لفافے میں بند کیا اس پر منوچہر کا دیا ہوا ایڈریس لکھا اور اپنے بیگ میں ڈال دیا۔

درحقیقت اسے نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹ کر بھی سوچوں میں گم تھی۔

رگوں میں قرب کے لمحوں کا زہر جھوڑ گیا
جو ایک شہر میں قاتل تھا شہر چھوڑ گیا

اب وہ دھڑکتے دل سے گھر سے باہر نکلتی تھی۔ اس کی موٹر بہت دنوں تک اس نے نہیں دیکھی تو جیسے گویا اس کا سب کچھ کہیں کھو سا گیا۔

دل کو ڈھیروں وہم آ۔ بھلا کسی اجنبی پر یوں بھی بھروسا کیا جاتا ہے۔ مگر اس نے پتا تو دیا ہے مگر اس پتے پر لکھے خط کا جواب بھی نہیں آیا؟ وہ اس قدر مضطرب اور بےچین تھی کہ ہر کام بھول بیٹھی ایسا لگتا گویا وقت کا کوئی مصرف ہی نہیں رہا ہر چیز بے کار ہر بات غیر ضروری محسوس ہوتی تھی۔ بہن بھائیوں کے چہرے اسے محض سا لگنے لگے۔ امی کا کسی کام کو کہنا انتہائی ناگوار محسوس

ہوتا۔ خالہ جان کی محبت پاش نظریں، دیکھ کر تلوؤں سے لگتی اور سر پر بجھتی تھیں۔ جی چاہتا کوئی اسے نہ بلا کوئی کسی کام کو نہ کہے اگر وہ اکیلے اور اندھیرے کمرے میں بیٹھی ہو تو کوئی آ کر اسے ڈسٹرب نہ کرے اپنے گروپ سے علیحدہ کٹ کر رہنے لگی تھی۔ جرنل ورکنگ کا بہانہ بنا کر لیبارٹری کے ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ مزاج تلخ سا رہنے لگا تھا۔

صرف چار دن تو گورے تھے کہ یہ صورت حال تھی۔

کالج سے واپسی پر وہ وسیم سے پوچھتی۔ وسیم۔ پوسٹ مین آیا تھا؟ وہ بینیازی سے شانے اچکا کر بھاگ جاتا۔

آج اس صورتحال سے دوچار ہو پانچواں دن تھا۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی، خالہ جان وضو کر کے جا نماز بچھا رہی تھیں۔ امی غالبا وضو کر رہی تھیں۔ پاپا مسجد جا چکے تھے۔ اور سمیع شاید اکیڈمی، وہ بھی نماز کا ارادہ بلکہ دعا کا ارادہ کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون اٹھایا۔

ہیلو؟

منوچہر آفتاب۔

اس کے جسم پر جیسے رعشہ سا طاری ہو گیا۔

اس نے رکوع میں جاتی خالہ جان اور جائے نماز بچھاتی ماں کو دیکھا بہت آہستگی سے بولی۔

ہولڈ پلیز۔ ریسیور رکھ کر پاپا کے کمرے میں بھاگ گئی ایکسٹینشن اٹھایا۔

ہیلو اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کر کہا خوف اور خوشی سے برا حال تھا۔

خیریت تو ہے ناں؟ منوچہر کی حواس چھین لینے والی آواز ابھری۔

آپ خیریت کے معنی جانتے ہیں اس کا لہجہ خود بخود شاکی ہو گیا۔

اس قدر حسین و خوش قامت و خوش آواز لڑکی کا نخرہ اس کے جذبات کو تپا گیا۔

میں ایبٹ آباد سے بول رہا ہوں، اپنے آبائی گھر سے، یہاں میرے والد علیل ہیں بہت ایمرجنسی میں آیا ہوں۔

اور فون اتنے دن بعد کیا؟

تم یقین نہیں کرو گی۔ یہاں صورت حال ہی کچھ ایسی تھی کہ۔ مجھے احساس تھا کہ تم مجھے فراڈ۔ یا کھلا دھوکا سمجھ رہی ہو گی۔ کہ تم سے تو مراسم بھی ابتدائی ہوتے، اور میں نے تمہارا اقبال جرم بھی پڑھ لیا۔

اقبال جرم۔ وہ کچھ سمجھی نہیں۔

تم نے وہ خط اسی طرح تو لکھا ہے گویا کسی جرم ک؛ مرتکب ہو رہی ہو۔ یا پھر کسی ایڈیٹر کو صفائی کے مسئلے پر۔

مجھے خط لکھنا نہیں آتا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

خط خیال کی تحریری شکل ہوتی ہے۔ اس کے لیے کوئی علیحدہ سے اہتمام تو نہیں ہوتا۔ میں

پابندی پسند نہیں ہوں۔ سن رہی ہو سارا؟ مجھ پر پابندی نہ لگاؤ، ملنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے سمجھ جاؤ۔ تاکہ بعد میں تمہارے کسی دل دکھا دینے والے الزام سے مبرا رہوں۔ یہ بہت ضروری ہے سارا فرض کرو اگر تمہارے والدین انکار کر دیں تو تم میری عادات واطوار خاندانی پس منظر سے واقفیت کی بنا پر میرے لیے ان سے ضد کر سکو۔

محض تمہارا حسن پاگل نہیں کر گیا ہے مجھے۔ میں قیافہ شناس ہوں تمہیں ایک نظر میں پڑھ چکا ہوں۔ میں تمہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا سنا تم نے، میں جب کہوں گا تم مجھے ملو گی شیشے سے بڑھ کر سمجھوں گا۔ میں کراچی جلد آؤں گا۔ اعتماد کرنا سیکھو سارا، ایسے کام نہیں چلتے۔

اسی وقت خالہ جان اندر چلی آئیں۔

سارا۔ بیٹے نماز نہیں پڑھی؟ کیا بہت ضروری فون ہے؟ نماز ہر چیز سے زیادہ اولیت رکھتی ہے۔

اچھا فریدہ خدا حافظ۔ اس نے گھبرا کر فون رکھ دیا رخ موڑ کر بیزاری سے بولی۔

میری سہیلی کا فون تھا خالہ جان۔

ایسے ناوقت فون کیا تھا اس نے، نماز بھی قضا ہو گئی۔ انہیں ملال ہوا۔

ہونہہ۔ ایک یہ ہیں ہر وقت پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ سب نے اپنی اپنی قبر میں جانا ہے، بڑی جنتی، بہشتی سمجھتی ہیں خود کو، ہونہہ۔ اسے ان کی آمد بہت کھلی تھی۔ بہت سی گستاخ اور من مانی کرنے والی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی سخت الجھن محسوس کی تھی نصیحت پر۔

اسے ایک گونہ سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

کافی دنوں بعد اس نے خوش خوش کاموں میں حصہ لیا۔ امی نے تعجب سے اس کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھا مگر بولی کچھ نہیں تھیں۔

اس کے وجود میں گویا تازہ لہو دوڑنے لگا تھا۔ اس کے غیر معمولی حسین چہرے پر خوشی اور طمانیت چمکنے لگی تھی۔

خالہ جان نے دل ہی دل مین چشم بد دور کہہ کر اسے تصور میں اپنی بہو کے روپ میں دیکھا جے دیکھ دیکھ کر لوگ خدا کو یاد کر رہے ہیں۔ وہ دراصل کراچی آئی ہی اسی لیے تھیں کہ اس کو دیکھ لیں کہ کیسی ہو رہی ہے۔ پرکھ لیں کہ کیا کر رہی ہے؟ ہوش گم کر دینے والا چہرہ بجلی کی طرح چمکتا، قامت گویا سانچے میں ڈھالا گیا ہو۔ اس پر سے اپنے حسن سے حد درجہ لاتعلقی کا انداز بالکل ہی لاابالی سا انداز۔

وہ صورت پر تو بچپن سے ریجھ گئی تھیں۔ اب تو سو جان سے واری صدقے تھیں ڈھونڈنے سے کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی سوا لاپروائی کے۔ وہ بھی اس کا بچپنا خیال کر لیا گیا۔ انہوں نے سوچ لیا۔

وہ یہاں سے جاتے ہی میاں سے مشورہ کر کے فورا رشتے کے لیے خط لکھیں گی۔

امی کل ساتھ والوں کے ہاں بنٹی کی سالگرہ ہے ناں۔ میں آپ کی نیلی ساڑھی باندھ لوں؟ اس وقت اس کے سب سے بڑے حمایتی پاپا بھی تھے۔ اس نے موقع غنیمت جانتے ہو

کھانے کی میز پر ہی مسئلہ چھیڑ دیا۔

کوئی ضرورت نہیں ساڑھی واڑھی باندھنے کی بہت کپڑے ہیں تم انہی میں سے کوئی پہن لینا۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں بات کی۔

مجھے پتا تھا پاپا۔ امی یہی کہیں گی۔ س کا منہ پھول گیا۔

ارے بھئی کیا حرج ہے پہن لینے دو ساڑھی۔ انہوں نے اپنا مخصوص کردار نبھایا۔

اجی رہنے دیں۔ آپ نے اس کا دماغ اور بھی خراب کر دیا ہے۔ کہہ دیا نہیں پہنتی ساڑھی۔ وہ بگڑ کر بولیں۔

پاپا۔ امی تو سگی امی ہی نہیں لگتیں۔ اس نے شکایتی انداز میں ماں کو دیکھا۔

مارے خفگی کے وہ جلد میز سے اٹھ گئی۔

بھئی تم بھی ناحق اس پر سختی کرتی ہو۔ پاپا کو افسوس ہوا۔

آپ کو کیا پتا۔ میں کیا سوچ کر منع کرتی ہوں، باندھ کر چلی جا گی ساڑھی ہفتے بھر بستر پر پڑی رہے گی۔ میٹھا خون ہے فوراً نظر لگ جاتی ہے۔ ساڑھی تو بہت ہی سجتی ہے اس پر۔ وہ بہن کی طرف دیکھتے ہو بولیں۔

سچ آپا جان، کہیں جانا غضب ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا وہیں سے رخصت کرا کر لے جائیں۔ رشتوں کی بوچھاڑ ہے۔ اور ایسے میں فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کون سا رشتہ اچھا ہے اور کون سا نامناسب۔ آپ کو شاید محسوس ہو کے میں اپنے منہ سے بیٹی کے حسن کی

تعریف کر رہی ہوں مگر میں تو کہتی ہوں حسین بیٹی بھی ایک امتحان ہوتی ہے۔

اے ہاں۔ ماشائاللہ۔ انہوں نے بھی بہن کی تائید کی۔

ہمارے ہاں تم ہی سب سے خوبصورت تھیں۔ بیٹی تم سے زیادہ، بھائی افضل نے مجھے اتے آتے کہا کہ ان کے لڑکے کے سلسلے میں تمہاری را معلوم کروں۔ لو بھلا میرے ہاں لڑکا نہیں ہے کیا؟

ساجدہ کا دل خوشی سے دھڑکا۔ بہن نے آخر ان کے مطلب کی بات منہ سے نکال ہی دی۔

آپا جان، ابھی اس کی عمر بھی کیا ہے۔ ابھی تو ہمارا ارادہ بھی نہیں ہے۔ جسے دیکھو رشتہ لیے چلا آتا ہے۔ منع کر دو تو برا مان جاتا ہے۔

اب کوئی کہے تو کہہ دینا کہ بھئی کر دیا ہے ہم نے اس کا رشتہ۔ آپا جان نے مشورہ دیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ساجدہ ان کے ہاں رشتہ کرنے پر رضامند ہیں۔ لہذا انہوں نے بہنوئی کو بطور خاص سنانے کے لئے یہ مشورہ دیا تھا۔

تاکہ بہنوئی کے تاثرات بھی جان لیں جو واش بیسن کے سامنے کھڑے ہاتھ دھو رہے تھے۔ بھول گئیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں میاں سے مشورہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور اب اپنے طور پر ہی بات نکال بیٹھی ہیں۔

نثار صاحب تو ویسے ہی ان کے گھرانے کو پسند کرتے تھے ظاہر ہے اچھے ہی تاثرات

دیے۔ بات کھلی بھی نہیں اور ڈھکی بھی نہیں رہی۔

فریقین اپنے طور پر مطمئن ہو چکے تھے۔

وہ بجبرا اپنے کمرے میں اوندھی لیٹی اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایسا شخص اس کی زندگی میں دوبارہ نہیں آ سکتا۔ وہ اسے نہیں گنوا گی

ملیں جب ان سے تو مبہم سی گفتگو کرنا

پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

وہ کالج سے نکلی تو پہلے دن کے چور کی سی کیفیت ہو گئی۔

وہ عین گیٹ کے نزدیک تھا اس نے پایہ استقامت کی لرزش قابو کی اور نظر انداز کرتی ہوئی پوائنٹ کی سمت بڑھ گئی۔

میں فلرٹ و محض رومان پسند لڑکی نہیں ہوں۔

میں نے اپنے شریک سفر کو بالکل ایسا ہی دیکھنا چاہا ہے۔

اسے میرا محبوب نہں شریک سفر بن جانا چاہیے۔ نسلوں کا اکتساب لہو بن کر اس کے جسم میں دوڑنے لگا۔

پوائنٹ خالی تھا وہ کھڑکی کے نزدیک والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چور نگاہوں سے باہر کی سمت دھا اس کی موٹر حرکت میں آ گئی تھی۔ اس کے اندر کچھ ہونے لگا۔

اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ افسوس کرنے لگی۔ اتنے دنوں بعد تو آیا تھا۔ جس کے لیے وہ بجلی ماہی بنی رہی تھی۔ آخر اس نے یہ حرکت کیوں کی اسے آزمانے کو؟

آخر میرا تماشا بھی تو بن سکتا ہے۔

مم۔ میں دراصل اس سے ڈرتی ہوں۔ اس کے سامنے اس کی کسی بات سے انکار کا حوصلہ نہیں ہوتا حدا معلوم کیا کہہ دیتا اور میں مان لیتی۔

منوچہر۔ میں تو فون پر منتظر رہی کہ آپ خوش خبری سنائیں گے۔

اس نے حود کو بہلایا۔ موٹر نظروں سے اوجھل ہو گئی دل پر جیسے منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ کہیں وہ ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ عظیم الشان آدمی۔ جیسے کوئی لارڈ۔ نہیں جیسے کوئی ڈیوک ان کے ساتھ یہ حرکت زیب نہیں دیتی۔ سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں ہوتی ہیں یہاں۔ اور وہ صرف میری خاطر۔

اس شام سے رات تک اس نے فون کی باریک سی گھنٹی کا انتظار کیا۔

پھر اس کے بعد اس نے موٹر بھی نہیں دیکھی۔

اس کا فون بھی نہیں آیا۔

کوئی خط بھی نہیں آیا۔

پورے ہفتے بھر وہ خود کو کستی رہی یہ اس نے کیا کر دیا کھو دیا اسے؟

نہیں۔

بلکہ وہ کھل گیا۔ یقیناً اس نے مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ چلو اچھا ہوا۔ مگر۔ وہ ہا

اللہ کیا کروں؟

خط لکھ دیتی ہوں۔ دیر تو نہیں ہوئی۔ وہ کھو نہ جا اس نے کاغذ قلم سنبھالا۔

پھر رکھ دیا۔

اس میں انا نہیں جاگی تھی۔

وہ شاید اس کی سچائی جاننے کے لیے خود ہی بضد ہو گئی تھی۔

ہفتے کی سہ پہر جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو امی نے زرد رنگ کا لفافہ اسے تھمایا۔

اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے ماں کی سمت دیکھا واپس پلٹ گئی تھیں۔ لفافہ بند تھا۔

اس نے بے تابی سے چاک کیا۔

پرنسس

خوش رہو

غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے ناں۔ مجھ سے بھی ہو گئی اگر تم میری طلب سے میل کھاتی ہو تو یہ بھی میری غلطی ہے۔

سارا واقعتاً راہ چلتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی بتاؤ اگر پیاسے مسافر کو راہ میں کنواں مل جا تو اسے کیا کرنا چاہیے؟

میں تمہیں معصوم سمجھا تھا تم تو پتھر ہو۔

ایک ہفتے تک ذہنی عذاب بھگتنے کے بعد تم سے آخری بار مخاطب ہو رہا ہوں۔ یہ میرا مقام نہیں تھا۔ تم نیچھے کہاں پہنچای۔ میں نے لڑکی پہلی مرتبہ نہیں دیکھی تھی۔ سچ تو یہ ہے ایسی نہیں دیکھی تھی۔ حقیقت میں جس کا پلہ بھاری ہوا سے موقع سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے۔

تم فائدہ اٹھاؤ، میں ملال سہتا ہوں۔ دنیا میں بہت سیو اقعات ہوتے ہیں جو قوت برداشت کا امتحان ہوتے ہیں۔ پھر بھی لوگ زندہ رہتے ہیں۔ میں بھی کوشش کروں گا۔ برا مہربانی خط، فون وغیرہ کی تکلیف نہ کرنا۔

منوچہر آفتاب

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبا دیا۔

یہ کیا ہو گیا؟۔

یہ میں نے کیا کر دیا۔ کیا اب مجھے وہ زندگی، وہ محبت وہ مقام مل سکے گا جو اس کی ذات کے حوالے ملتا۔؟

سب سے بڑھ کر۔ اس قدر شدید محبت۔

میں نے اس کی قوت برداشت کا امتحان لے کر بہت بڑی غلطی کی۔ اپنی خوش بختی پر خود ہی روک لگا دی۔

اسے کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا۔

رات کو وہ پاپا کے کمرے کا ایکس ٹینشن پلگ کال آئی تھی۔ خالہ اور امی ساری رام کہانیاں سنا کر سو گئیں تو اس نے تین عددی نمبر ڈائل کیا۔

کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے فون اٹھایا۔

ہیلو۔ ڈبل فور زیرو۔

وہی تھا۔ اس نے خشک گلے کھنکھار کر کہا۔

سارا بول رہی ہوں۔

فون فوراً رکھ دیا گیا۔ احساس توہین۔ ملال اور شاید محبت وہ کھڑی ہونٹ جباتی رہی۔ دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے تھے کہ یہ عمیق اور گہرے جذبے حساس لوگوں کے جی کا ہی تو آزار ہوتے ہیں۔ لڑکی حساس ترین ہو۔ آگاہ ہو وہ رومان پسند و جذباتی ہو تو جنگل کی آگ کی طرح شدت سے بھڑکتی ہے کہ گندم کا خمیازہ میزان کے دن تک جاری ہے۔

جذباتیت بیوقوفی کا زینہ ہے۔

اس نے سمندر نہیں بہا۔ پھر نمبر ڈائل کیا۔

گھنٹی بجتی رہی۔ آخر کار فون اٹھالیا گیا۔

پلیز، میری بات تو سن لیں۔

آدھی رات کو شعلوں کو ہوا نہ دو سارا میں ذہنی سکون کے لئے سونا چاہتا ہوں۔ مجھے اس وقت تمہاری طلب ہے۔ میرا امتحان ہے تو تمہارا ابھی امتحان ہے۔

کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر بولی۔

کیوں فون کیا ہے؟

یہ کام تو با اختیار کرتے ہیں۔ تمہیں نہ اعتبار کرنا آتا ہے نہ محبت۔ بزدل محروم رہتا ہے۔ سارا۔

شادی بیاہ کھیل تو نہیں ہوتا۔ وقت تو لگتا ہے ناں۔

تو آپ خوشی خوشی انتظار کر لیں ناراض کیوں ہوتے ہیں؟

تم کم عمر ہو بہت سی باریکیوں سے ناواقف۔ کل شام تم مجھے ضرور ملو نہیں تو۔

و۔۔ وہ مگر۔

شیزان میں، خدا حافظ۔

کبھی بھی نہیں منوچہر کبھی بھی نہیں۔ وہ حود سے گویا ہوئی تھی۔

اس کے انداز میں استقامت تھی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

☆

یہ تبسم، یہ تازگی، یہ نکھار
زندگی کس سے بات کر کے آئی ہے؟

اس نے دھڑکتے دل سے شیشے کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس تنہا بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

اس نے پرس اور فائل سینے سے لگا رکھی تھی۔ ڈارک براؤن تھری پیس سوٹ میں وہ اتنا باوقار اتنا شاندار لگا کہ وہ ایک لمحے کو خود پر نازاں سی ہوگئی۔

وہ میز کے سامنے آ ٹکی۔

آداب

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اسکی خوش امید رنگ لے آئی تھی۔

تسلیم جناب۔ اگر آپ یہ رنگ نہ دکھائیں تو روایت کیونکر پوری ہو۔ اس کیا انداز مین شکوہ تھا۔

وہ بیٹھ گئی۔

میں ضروری کام سے کراچی آیا تھا۔ تقریبا ایک ماہ کے بعد پھر ایبٹ آباد جا رہا ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ خط لکھوں گا، جواب آ گا ناں؟

اس کا سر جھکا رہا۔

اس مرتبہ میں گھر والوں سیضرور بات کروں گا۔ تم بے فکر رہنا۔ کم از کم تم اعتبار تو کرو گی ناں؟

کیا منگاؤں؟

کچھ نہیں۔ اس کے لب ہلے۔

ایسا تو خیر نہیں ہوسکتا۔ مہمان ہو میری۔ ہاں اب آئندہ انشا اللہ ہم آپ کے مہمان ہوں گ۔ ۔ے اور آپ کی میزبانی سے حظ اٹھائیں گے۔ وہ بڑے انداز سے بولا۔

اس نے ویٹر سے کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس لانے کو کہا۔ وہ سب ڈر اور خوف بھول گئی۔ چند ماہ بعد یقیناً وہ اس کی ہوگی۔ بعض لوگ سراپا یقین ہوتے ہیں اس نے جور نظروں سے منوچہر کو دیکھا۔

منوچہر اس کے حسین چہرے پر نظریں جما جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

وہ واقعتاً بےپناہ حسین تھی۔ اس کا ایک ایک نقش بولتا تھا۔ میزوں پر بیٹھے ہو مرد حضرات اس کی جانب گاہے بگاہے ضرور دیھک لیتے تھے۔

شانوں پر سفید دوپٹہ بیپروائی سے پڑا ہوا تھا۔ دوپٹے سے چھلکتا اس کا وجود اسے ایسی چیو بنا رہا تھا۔ جسے اٹھا کر لے بھاگنے کو جی چاہتا ہے۔

وہ اس کے بہت نزدیک تھی مگر پھر بھی بہت دور تھ۔ وہ ابھی اس کے کہے مین نہیں تھی۔

بہت سی آمادگیوں کے کالے کوس منوچہر کو پاپیادہ طے کرنا تھے اس نے آج اس حسین کتاب کا ایک صفحہ اور پڑھنا تھا۔

لوگ اس کی جانب متوجہ تھے۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔

بلاشبہ یہ منوچہر ہیں ہی ایسی چیز جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے بہت یقین اور وعدوں کے وزن اٹھا اور کھڑی ہوگئی تھی۔

اب میں چلوں گی بہت دیر ہوگئی ہے۔ اس نے گلاس آہستہ سے رکھا۔

ہاں۔ کچھ مہینوں کے اضطراب ابھی میرا مقدر ہیں۔ وہ گلاس ہاتھ میں تھامے شکستگی سے بولا۔ میں ڈراپ کر دوں گا تمہیں۔ اس کی تشنہ نظریں اس کے سراپے پر دوڑنے لگیں۔

نہیں۔ نہیں۔ بہت دیر ہو گئی۔ سمیع یا پاپا تو روڈ پر آ کھڑے ہو ہوں گے۔ وہ گھبرا کر بولی۔

خط کا جواب تو دو گی ناں؟

آئی ول ریپلائی پرائڈڈ دیٹ یو واک آن دی رائٹ۔

بیرا اسے اٹھتے دیکھ کر قریب آ کھڑا ہوا تھا لہذا وہ انگریزی میں بولی۔

اب تم بزرگوں کی طرح نصیحت مت کرو۔ میں اپنے طور پر بالکل صحیح راستے پر چل رہا ہوں۔ جو راستہ بھی تمہاری طرف جاتا ہے۔ صحیح ہے۔

وہ اسے والہانہ دیکھتے ہو بولا۔

لیٹس گو۔ وہ چابیاں اٹھاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ بل مع ٹپ خوبصورت سی پلیٹ میں رکھا۔

نہیں۔ نہیں۔ میں ے کہا ناں۔ آئی ول گو الون۔

اتنی محتاط رہو گی تو مجھے خدشہ ہے مجھے محروم ہی رکھو گی۔

جی۔؟ وہ حیرانی سے بولی۔

کچھ نہیں۔ وہ بڑے گریس سے مسکرایا۔

صف 44

دونوں آگے پیذ چے باہر نکل آ۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ اس کی مطلوبہ بس سامنے ہی کھڑی تھی۔

وہ خدا حافظ کہہ کر بس کی سمت تیزی سے بڑھی تھی۔

وہ ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ سارا گھر پریشان تھا۔

وہ سب کو اپنا منتظر دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

ایگزیم نزدیک ہیں ناں۔ جو پریکٹیکل مس ہو گئے تھے ان کو کرنے میں دیر ہو گئی۔ اس نے ماں کی پریشان اور متجسس نظروں کا فوری جواب دیا۔

اگر ایسی بات تھی تو کہہ کر جاتیں۔ امی نے مخصوص سنجیدہ انداز میں کہا۔

آئندہ بنا کر جاؤں گی۔ یاد نہیں رہا تھا۔

سامنے سے خالہ جان کو آتا دیکھ کر وہ جلدی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر اندر بہت ہی شور مچاتا ہے۔

اسے ایسا محوس ہوا کہ اگر کچھ دیر اور کھڑی رہی تو یہ سب حقیقت کھوج لیں گے۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تو وہ بھی مگن ہو گئی اس کے تصور میں۔ اپنا اچھا سوچنا سب کا حق ہے۔ جو چیز میں نے پائی ہے۔ اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے پھر اپنا فیصلہ دہرایا۔ وہ اسے نہیں گنوا گی۔

شب بھر تھا انتظار کہ پھوٹے گی روشنی

جاگے تو روشنی کو اندھیرے نگل گئے
شیشہ گروں کے شہر میں گزری تمام عمر
پھر بھی یہ پوچھتے ہو کیوں کر پگھل گئے

خالہ جان واپس ہو چکی تھیں۔ اور جاتے ہی دھماکا بھی کر دیا تھا۔ یعنی باقاعدہ رشتہ مانگ لیا تھا۔ گذر بھر کو خوشی تھی، نہایت ہی مناسب رشتہ تھا۔

امی نے تو خوشی سے بیقابو ہو کر اپنی چہیتی اور بوڑھی پڑوسن کے سامنے تذکرہ بھی کر دیا۔

اماں۔ رشتہ بالکل میری مرضی کے مطابق ہے۔ سگی بہن ہے میری، ایک ہی بیٹا ہے۔ یہ تو ویسے بھی تنہائی پسند ہے۔ کوئی نہیں گھر بھر میں۔ ماں باپ اور بیٹا وہی مثل ہے کہ ایک میں میرا مونس تیسرے کا منہ جھلے۔ عیش کرے گی عیش۔

اس کی خالہ کا گھر گویا میکا بھی سسرال بھی۔

خیر دلہ یہ تو نہ کہو، ساس نام کی خالہ اس کا بھی منہ کالا۔ ساس کا تو رشتہ ہی اور ہوتا ہے۔ دعا کرنی چاہیے کہ بٹیا سکھی رہے۔ جو تم سوچ رہی ہو وہی ہو۔ اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں نصیب کرے۔

وہ واش بیسن کے پاس کھڑی ہاتھ دھو رہی تھی۔ اس کے تو گویا پاؤن تلے سے زیمن سرک گئیی تھی۔ وہ خواہ مخواہ ہاتھ مسل کر جھاگ بنانے لگی۔

یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اوہ میرے خدا میں تو مر جاؤں گی۔ اس کا دل جیسے بیٹھنے لگا۔ آخر کر گئیں بڑی بی اپنا کام۔ ہر وقت نظروں سے تولتی رہتی تھیں۔ تو یہ وجہ تھی؟ اتنی دور بیاہنے آئیں گی۔ کیا لاہور میں لڑکیاں نہیں ہیں؟ اسے خالہ سے نفرت سی محسوس ہوئی۔ گویا اس سارے کیے دھرے کی قصوروار صرف وہی ہوں میں یہ سب کچھ کبھی نہیں ہونے دوں گی، اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ ہر شے سے ٹکرانے کا۔

رات کو اس نے تفصیل سے منوجہر افتاب کو ہر بات لکھی۔ اور اس کے جلدی آنے پر اصرار کیا۔ منوچہر کا تشویش بھرا جوابی خط فورا آ گیا تھا۔ اس نے منصور کے بارے میں کچھ باتیں پوچھی تھیں اور اس کا ایڈریس بھی معلوم کیا تھا۔

اس نے فوراً ہر بات لکھ بھیجی جو منوجہر نے معلوم کرنا چاہی تھی۔

اور اس خط کے جواب میں منوچہر خود آ گیا تھا۔ اور آتے ہی شام کو فون پر اطلاع دی تھی۔ اور اسے اپنےگھر آنے کو کہا تھا کہ وہ چند اہم باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو ان دنوں بالکل بدحواس تھی۔ ہر وقت یہ کھٹکا تھا کہ کچھ ہو نہ جا۔ اسی سلسلے میں آج وہ منوچہر کے حشمت کدے میں نظریں جھکا بیٹھی تھی۔ نوکر نے اسے بتایا کہ صاحب غسل فرما رہے ہیں۔

وہ انتظار کی کوفت کا ذائقہ چکھنے لگی۔ کئی بار کی ملاقاتوں نے اسے بیپناہ اعتماد بخشا تھا۔ آج وہ ذہنی طور پر اتنی آزاد اور ہلکی پھلکی تھی کہ کاؤچ پر لیٹ کر ورق گردانی بھی کر سکتی تھی وہ گھاگ اور شاطر تیز وطرار لڑکی نہیں تھی اور انسانوں کی سمجھ تو اسے ویسے بھی نہیں تھی۔

عموماً پارٹیز سے واپسی پر وہ ماں سے کہتی۔

امی۔ وہ جو صفیہ آنٹی کی کزن تھی ناں۔ اللہ ریڈ ساڑھی میں کیا غضب ڈھا رہی تھیں۔

ہاں مگر خدا محفوظ ہی رکھے۔ بہت تیکھی لگتی تھی ناکوں چنے چبوا دیتی ہیں ایسی لڑکیاں۔

اور جب وہ ایک چھوٹی سی بچی تھی اور سامنے والے کریانہ اسٹور سے چیونگم، ٹافیاں لالی پاپ وغیرہ خریدا کرتی تھی۔ ایک شام بازار سے واپسی پر وہ ماں کے ساتھ ہی ٹافیاں خریدنے اسی مخصوص اسٹور میں گھس گئی تھی۔

گھر آ کر امی نے کہا تھا۔

سارا بیٹے۔ تم آئندہ اس اسٹور پر تنہا نہیں جاؤ گی۔

کیوں امی؟

زمانہ بہت خراب ہے۔ وہ بڑبڑائی تھیں۔ اپنے پاپا سے کہہ دیا کرو جو چیز بھی تمہیں چاہیے۔ شام کو واپسی پر لا دیا کریں گے۔

اس وقت اس کا ننھا سا ذہن سوچوں میں گھر کر رہ گیا تھا۔ آج اسے یونہی ماں کی بات یاد آ گئی تھی۔ امی کہا کرتی تھیں۔

آبرو عورت ہی کی نہیں مرد کی بھی ہوتی ہے۔ بیحد آبرومند ہوتا ہے وہ مرد جو عورت کی کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں بیحد عقل مند عورت ہے اسے انسانوں کی سمجھ ہے لیکن۔ امی نے بہت سے لوگ دیکھے ہیں منوچہر کو تو نہیں دیکھا۔ امی ابھی ادھوری ہیں۔ اس نے عظیم الشان ڈرائینگ روم میں نظریں گھمائیں۔

کشادہ حصے سے منوچہر برآمد ہوا۔ ہیلو۔

وہ ریچھ کی کھال جیسے سیاہ باتھ گاؤن میں تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

وہ اس بے تکلف انداز میں بھی بیحد دلکش لگا۔ شیشے کی طرح چمکتا، دمکتا نفیس مرد اس نے پائپ میں تمباکو بھرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا جواب سنے بغیر۔

آپ کبھی تمباکو۔۔۔ میرا مطلب ہے کبھی پائپ پیتے ہیں۔ اور کبھی سگریٹ۔

اس نے کچھ بھی بولنے کے بہانے گویا یہ جملے کہے تھے۔ جملوں میں نزاکت اور اپنائیت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ جیسے وہ در و دیوار ہی پر جتا رہی ہو کہ۔ یہ جو عالیشان مرد ہے ناں۔ میرا ہے۔ پاگل ہے میرے لیے۔

ہاں۔ بس ایسے ہی ذائقہ بدلنے کے لیے یا پھر یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ مختلف ذہنی کیفیات کے مختلف انداز ہیں۔

سارا۔ تم نے مائنڈ نہیں کیا ناں کہ میں نے تمہیں یہاں بلایا۔ بات یہ ہے کہ میں تمہاری احتیاط اور گفتگو سے اندازہ کر چکا ہوں کہ تم بہت مہنگی ہو۔

جی؟ وہ چونک اٹھی۔

کیا یہ میرے دام لگا رہا ہے۔ اسے یہ جملہ انتہائی ناگوار گزرا۔

میرا مطلب ہے۔ معاشرتی طور پر لوگ اپنے بھرم اور عزت کا ایک پیمانہ بنا لیتے ہیں۔ ایک طبقے کی جس بات سے ناک کٹتی ہے دوسرا اسے روشن خیالی کا نام دیتا ہے۔ میرا مقصد یہی

ہے کہ تمہارے ہاں شاید پابندیاں، بھرم اور عزت کا تحفظ سمجھی جاتی ہیں۔

خیر۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ کیا جواب دیا تم نیوالدین کو۔

ابھی تو کچھ نہیں۔ انہوں نے ابھی مجھ سے پوچھا بھی نہیں اور شاید پوچھیں بھی نہیں۔ امی تو مجھے بیحد ناسمجھ سمجھتی ہیں۔ وہ اس کی سمت دیکھے بنا بولی۔

یہ کیا بات ہوئی؟ پھر تم انکار کیسے کرو گی؟

آپ کے گھر والے آئیں گے تبھی کچھ کر سکوں گی۔

چاہے اس اثناء میں کچھ ہو جا۔

خدا نہ کرے۔ اس کی نظریں بدستور نیچی تھیں۔ اتنی ملاقاتوں کے بعد وہ اس پر اندھا یقین رکھتی تھی۔ ڈر تو قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ خواہ مخواہ ہی بس سانسیں اتھل پتھل ہو جاتی تھیں۔

میں نے بات کر لی ہے، انہیں کوئی اعتراض نہیں ذات پات کا کوئی مسئلہ نہیں اونچائی نیچائی کی کوئی بات نہیں۔ تم میری پسند ہو۔ ان کے لیے یہی بہت ہے۔ میں تمہیں البم دکھاتا ہوں۔ ٹھہرو۔

وہ سامنے کارنس کی سمت سے ایک سیاہ البم اٹھا لایا۔

اسی دم نوکر بھی ٹرالی لیے چلا آیا۔

چا بناؤ سارا۔

کتنا اچھا لگتا ہے اس کا یہ بے تکلف انداز۔ وہ جانتا تھا وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے تو وہ ساری جان سے کانپ جاتی ہے۔ جب وہ نظریں جھکاتی تو وہ سیر ہو کر دیکھتا۔

وہ چا بنانے لگی۔ پلکوں کی جھالریں رخساروں پر سایہ فگن ہو گئیں۔

مرد کی محبت پاش نظریں تو سورج کی حدت کی طرح سے محسوس ہوتی ہیں۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں جذبے تو روشن تھے۔ اس کا جی چاہا کہے میں اس وقت اکیلی ہوں گھر میں مجھے مت ہولاؤ۔ مت دیکھو ایسے۔

چا اس کی سمت بڑھائی۔ اس نے چا تھام لی اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر ایک دم یوں اچھلی گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہے۔

اوں ہوں بیٹھو بھئی۔ کیا ابھی تک اتنا اختیار نہیں کہ تمہارے نزدیک بیٹھ سکوں؟ میں دراصل یہ البم دکھانا چاہتا ہوں تمہیں۔ یوں سمجھو تعارف کرا رہا ہوں فیملی ممبرز کا سٹ ڈاؤن سارا۔ اس نے سارا کا دودھیا بازو تھام کر بٹھا لیا۔ اور سارا تو جیسے طوفانوں کی زد میں آ گئی۔ وہ کانپ کر بیٹھ گئی۔

منوچہر نے البم کھولا۔ پہلے صفحے پر اس کی خود کی بڑی خوبصورت سی تصویر تھی۔ پھر اس نے ایک تصویر کی جانب اشارہ کیا کہ یہ میرے والدین ہیں۔

وہ تصویروں کی جانب کم متوجہ تھی اس کی قربت سے وہ بیپناہ سٹپٹا رہی تھی۔

وہ ہاف آستین شرٹ میں تھی اس کے صحت مند اور دودھیا بازو سے منوچہر کا نم گاؤن ٹچ ہو رہا تھا۔ سگریٹ اور کولون کی مکس خوشبو سے مہکتی سانسیں۔ وہ بہت گھبرا رہی تھی اور خود کو بیبس بھی محسوس کر رہی تھی۔

سارا۔ اس کے کان کے پاس سے آواز ابھر کر اس کے بچے کچھے حواس چھین کر لے جانے لگی۔

سارا۔ بعض لوگ اپنی آرزوؤں کے معاملے میں ضدی ہوتے ہیں۔ اپنے معیار سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے۔

پتا نہیں۔ وہ دل ہی دل میں بولی۔

ایسے لوگوں کے ان کے معیار کے مطابق چیز کا نہ ملنا ہی بہتر، نہ کہ ایسی چیز ملے جو ان کو مطمئن نہ کر سکے۔ جس چیز سے معیار کی تسکین نہ ہو وہ چیز طلب اور بھڑکا دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی دیکھو یہ کیسا مذاق ہوا تھا۔ یہ دیکھو۔ اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھی۔

کس کے بندھی ہوئی چوٹی ناک میں پری موٹی سی لونگ۔ اور بڑے بڑے بالے بھدی سی ناک۔ بغیر تراشہ کے موٹے موٹے ہونٹ

یہ میری ماں کی چہیتی بہن کی اکلوتی بیٹی ہے۔ یہ لوگ زمیندار ہیں اس کی ماں نے مرتے وقت میری ماں سے وعدہ لیا کہ اس کی شادی میرے ساتھ کر دی جا۔

کیا یہ میرے قابل ہے؟ قطعی نہیں۔ جب مرد پہلی بار اپنی بیوی کا گھونگھٹ اٹھاتا ہے تو وہ بارود بھری بندوق ہوتا ہے میں پہلی شب سے آج تک بھڑک رہا ہوں۔

وہ اس کی متغیر کیفیت سے قطعی غافل روانی اور بیباکی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی عمر اور شادی شدہ حیثیت کے بالکل مطابق اس کی گفتگو بلکہ طرز گفتگو تھی۔ ایک تو اس پر اس انکشاف کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ دوئم اس کی حالت غیر ہوگئی۔ روشنی کے جھماکے کیساتھ جیسے شعور کی وہ آنکھیں اس کے سر کے پیچھے لگ گئیں۔ جن سے وہ گزرگاہ پر نقش رفتہ دیکھنے لگی۔ مشاہدے سے لوگ سبق سیکھنے لگ جاتے تو تجربہ نام ہی مٹ جاتا۔

ہر شخص اپنی جنت اپنا جہنم اپنی بغل میں دابے پھرتا ہے۔

تم کہو گی کہ آخر شادی سے پہلے بھی تو میں نے اسے دیکھا ہوگا؟

میری والدہ کا گھرانہ بیحد قدامت پرست تھا۔ وہ بیحد خوبصورت ہیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ سادہ۔ یہ محترمہ اور دوسرے لوگوں کی طرح پردہ کرتی تھیں۔ بہت سخت پردہ، میں تعلیم کی وجہ سے بچپن ہی سے ہاسٹلز میں رہا ہوں عزیز رشتہ داروں سے میرا کوئی لنک نہیں رہا۔ میں ایک تصور پرست اور بیحد حسن پرست ہوں۔ تم ہی کہو کیا یہ میرے ساتھ مذاق نہیں۔؟ میں اسے خود سے دور ہی رکھتا ہوں۔ مجھے تنہا رہنا گوارا ہے لیکن۔

منوچہر نے اپنا بازو اس کی گردن کے پیچھے پھیلا لیا۔ وہ آگے کو کھسک گئی۔

اس کی قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

شاید میری خالہ نے اپنی بیٹی کو جان کر سختی سے پردہ کرایا۔ آخر جاتے جاتے کام دکھا گئیں نا۔ مجھے بدصورتی سے چڑ ہے۔ میں پہلے مقابل میں حسن تلاش کرتا ہوں۔ اس کی صورت میں نہ سہی آواز میں بولنے کے انداز میں، جامہ زیبی میں، ذہن میں، کہیں نہ کہیں سے حسن کھوج لیتا ہوں۔ تب ہی مقابل سے اطمینان سے بات کرسکتا ہوں۔ ورنہ ذہنی خلفشار میں مبتلا ہوجاتا ہوں۔ اور میری بیوی۔ ۔ ۔ بیوی کے اخفا حسن پر میں یقین نہیں رکھتا۔ اسے خوبصورت نظر بھی آنا چاہیے۔

کاش میری ماں اتنی سادہ نہ ہوتی۔ وہ تو اتنی خوش تھیں۔ وہی قدامت پسند سوچ کہ رشتہ گھر میں مل رہا ہے۔ میں ان دنوں ہیوسٹن میں تھا۔ جب مجھے شادی کا، اپنی شادی کا بلاوا بھیجا گیا۔

قدامت پرستوں کے ہاں جانے انٹلیکچوئل بچے ہوتے ہی کیوں ہیں؟

وہ بول رہا تھا وہ پتھر بنی ہوئی تھی۔

سارا۔ وہ اسے ساکت دیکھ کر گھبرا گیا۔

آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اسے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

یہ باتیں گھر میں بیٹھ کر بتانے کی تھیں۔ فون پر اتنی لمبی چوڑی بات کیسے کرتا۔ خط لکھتا تو ایک رم وضاحتوں کا لکھنا پڑتا۔ روبرو بیٹھ کر بات آسان ہوجاتی ہے۔

سارا۔ دو سال کنوئیں کے پاس رہ کر پیاسا رہا ہوں۔ تم میرا آئڈیل ہو، میں تمہیں ہر قیمت پر پانا چاہتا ہوں، خواہ مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانا پڑے۔

وہ بری طرح چونک گئی اور جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ اسے منوچہر سے ڈر لگنے لگا تھا۔ منوچہر نے اس کا مومی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے مزاحمت کرنی چاہی۔

بیٹھو سارا۔ یہ صورت حال بھی متوقع تھی۔ اگر میں تم سے یہ بات چھپالیتا۔ اس نے لپ اسٹک سے عاری عنابی اور بھیگے بھیگے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

منوچہر بھی کھڑا ہوگا۔ اور اپنے مضبوط ہاتھوں کا دباؤ اس کے کندھے پر ڈال کر زبردستی بٹھایا۔

اس نے سرد سے انداز میں اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا۔

سارا آؤ۔ میرے بتیڈ روم میں آؤ وہ جو اس دن میں ن تم سے تمہاری تصویر کا نیگیٹو لیا تھا۔ آؤ دکھاؤں اس کا کیا کیا ہے میں نے۔

وہ اپن اڈر اور خوف ظآہر کرنا نہیں جاہ رہی تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں لائحہ عمل مرتب کرلیا تھا۔ گھر میں نوکروں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اس کے دل کو کچھ کچھ ڈھارس تھی۔ وہ اس قدر انجان نہیں تھی کہ اس کی نظروں کے مفاہیم سے واقف نہ ہوتی۔

آپ مجھے یہیں دکھادیجیے۔ اس نے خود کو پرسکون کرلیا۔

منوچہر نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اسے آزادی اور من مانی پسند تھی اور حسن ناواقف۔ یقیناً اس سے غلطی سرزد ہوگئی۔ (یہ تو محتاط لگ رہی ہے)۔

اچھا ٹھہرو۔ فضل؟ اس نے نوکر کو آواز دی۔

جی صاحب

میرے بیڈ روم سے، ان کی تصویر اٹھا کر لاؤ۔

فضل چلا گیا پھر جلد ہی ایک بڑا سا فریم اٹھا لایا۔

انتہائی خوبصورت فریم میں سارا کا حسن سوا تر ہو کر کلوز اپ کی شکل میں مقید تھا۔

میں اس فریم میں الزبتھ ٹیلر کی ٹرانسپر سی بھی لگا سکتا تھا۔ لیکن مجھے تو وہی چیز پاس رکھنا پسند ہے۔ جسے میں ہاتھ سے چھو کر محسوس بھی کروں۔

سارہ کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔

مجھیہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ آخر اس نے ناگواری کا اظہار کر ہی دیا۔

پہلی مرتبہ ہر عورت اسی طرح گھبراتی ہے۔ اس کا لہجہ جھبات سے بوجھل تھا۔

ہم جلدی شادی کر لیں گے سارا۔

بیٹھو سارا، پلیز، بیٹھو سارا۔

اس کی خوشبوئیں، اس کی سگریٹ، اس کا گلیمر۔ سیاہ دھواں بن کر انکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔

یٹھو سارا۔ اس کا بھاری ہاتھ میں ایک موٹا سا انگارہ بن کر اس کے شانے پر ٹھہر گیا۔

سارا۔ تم نے تو سفر ہی نہیں کیا کبھی، لمبے راستے کے بعد بہت پیاس محسوس ہوتی ہے۔

وہ اس کے جال میں پھڑ پھڑاتے ہو بھی اوسان بحال رکھے ہوتھی۔ کہ وہ ایک بھرپور مرد تھا وہ نازک سی لڑکی۔

منو چہر مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ اس نے اپنی آواز پر قابو پا کر کہا۔

فضل، پانی لاؤ۔ پانی کے ذکر کے ساتھ ہی جیسے اس پر بھی چھینٹے پڑ گئے تھے۔ وہ کاؤچ سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا تھا۔

فضل پانی لے کر آیا۔ اس نے گلاس تھامنے کے ساتھ ہی فورا کہا۔

فضل۔ اس وقت کوئی رکشہ مل جا گا؟

دن کا ڈیڑھ بجا ہے بی بی۔ بہت رکشہ مل جائیں گے۔

اچھا میں چلتی ہوں بہت دیر ہوگئی ہے۔

میں چھوڑ آؤں گا تمہیں۔ وہ آہستگی سے یا شکستگی سے بولا۔

نہیں نہیں، آپ کو تیاری میں دیر لگ جا گی۔ میں فضل کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ اس نے جلدی جلدی گلاس چڑھایا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ باہر آ کر ایسا محسوس ہوا گویا کسی تہ خانے سے باہر آئی ہو۔

وہاں تک اس نے خود کو بہت سنبھالا ہوا تھا مگر رکشے میں بیٹھتے ہی جیسے وہ بھربھری مٹی کی طرح ڈھے گئی۔

بڑی مشکل سے خوف وندامت کے لمحوں میں ذخیرہ کیے ہواشکوں کو روکا ایک قیامت تھی

جو گزرنے والی تھی۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر۔

بھرم ٹوٹنے کی کیفیت وہی سمجھ سکتا ہے۔ جس کا کبھی بھرم ٹوٹا ہو۔

بعض چیزیں سن کر محسوس ہوتی ہین۔ اور بعض بھگت کر اس کا بایاں بازو اب بھی سلگ رہا تھا۔

ملال دو تھے۔ اول یہ کہ وہ کتنی سطحی لڑکی ہے۔ ظاہری چمک دمک سے کسی قدر مرعوب ہو جاتی ہے۔ دوئم۔ اس نے اپنے والدین کے ساتھ سخت زیادتی کی۔ ان کی اجلی و مصفا تربیت کو دھوکے کے داغ لگا۔

شکر ہے کہ۔ اس نے پھر شکر کیا۔ اگر کچھ ہو جاتا۔

کتنا مہربان ہے میرا رب۔ میری نیت تو ٹھیک تھی ناں میں اسے جیون ساتھی کی حیثیت سے پسند کر رہی تھی۔ میرا مقصد تفریح نہیں تھا۔

انسان کا لباس اس کی تہذیب ہوتی ہے۔ وہ کسی جانور کے ہتھے چڑھنے لگی تھی؟

اتنی محنت اس نے آج کے دن کے لیے کی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئی۔ امی تارا کو سوپ پلا رہی تھیں۔

السلام علیکم۔ اس نے روزانہ کے انداز میں سلام کیا۔

وعلیکم السلام۔ انہوں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

جلدی آ گئیں سارا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟

جی امی بس ایسے ہی سر میں درد ہے۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔

تو پھر دودھ ضرور پی لو۔ بھوکی مت رہو۔

امی میرا جی کسی چیز کو بھی نہیں چاہ رہا۔

وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کر لیا بیڈ پر گر کر وہ ہچکیوں سیروئی۔ انسان اپنی نظر میں خود ہی گر جاتا اس کے لیے کوئی چارہ گری نہیں۔

وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ خوف تھا کہ آواز باہر نہ چلی جا۔ بڑی دیر اس نے اپنے اندر کی وحشت پر نوحہ کیا۔ دیر تک اپنی حماقت پر ماتم کیا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا خودکشی کر لے۔ یہ میں نے اپنے ضمیر میں ہمیشہ کے لئے کیسی دراڑ ڈال دی ہے؟

وہ دن کتنے ہلکے پھلکے تھے۔ جب مرد کی بہکتی نظر۔ مرد کی وارفتہ نظر کا ادراک نہیں رکھتی تھی۔ جب اس نے اپنے اتنے پیارے والدین کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ اگرچہ یہ آج بھی ناواقف ہیں۔ چار ملاقاتوں پر اس ستارالعیوب نے پردہ ڈال کر رکھا تھا۔ ورنہ بات کوئی بھی ہو کب تک پردے میں رہتی ہے۔

اگر آج وہ اپنی بیوی کی بدصورتی کی کڑواہٹ میرے ضمیر کو منتقل کر دیتا تو۔ تو۔ میں کہاں جاتی۔

اگر گھر میں نوکر نہ ہوتے؟

اگر۔ اگر۔ بس اگر کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔

ایسا لگتا۔ جیسے در و دیوار اسے پرنس کہہ کر قہقہے لگا رہے ہوں اور جب اس کا ذہن گہری نیند میں ڈوب رہا تھا تو آخر سوچ یہ تھی کہ۔

بعض لوگ اپنا مقصد پانے کے لیے کتنی محنت کرتے ہیں اور۔ اور اب وہ اس کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا گی۔

رات ہوائیں تیز بہت تھیں بادل ٹوٹ کے برسا تھا
گلیاں کوچے جل تھل تھے سوچ کا صحرا پیاسا تھا

تین دن بعد بارش تھمی تھی وہ گم سم سی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ اسی وقت پوسٹ مین نے نیلا لفافہ تھمایا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا تھا۔ منوچہر کا خط تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ اس دن وہ ادھوری ملاقات کر کے آئی تھی وہ اس سے گفتگو کا طالب تھا۔

اس نے خط پڑھ کر نذر آتش کر دیا۔ ملال آنسو بن کر اس کے رخسار پر ڈھلک آیا تھا۔ پھر اس کے کئی خطوط آ خفگی سے بھرے۔ چوتھے خط میں اس نے بتایا تھا کہ وہ ہار ماننے والا نہیں ہے۔ وہ محبت کے علاوہ اسے طاقت سے جیت سکتا ہے کہ وہ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔

وہ اس خط کے جواب میں بھی خاموش رہی۔

پھر اس کا فون آ گیا۔

وہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی مگر کرنا پڑی۔ اگر فون وہ نہ سنتی تو گھر میں سے کوئی بھی فون سن لیتا۔

ہیلو۔

محروم بول رہا ہوں۔

جی؟

ناراض ہو؟

جی نہیں۔

پھر کیا بات ہے؟

کچھ نہیں۔

سارا۔ دیکھو میری آزمائش نہ کرو۔ بہت ضدی آدمی ہوں میں۔

میری شادی ہو رہی ہے۔ اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔

ایسا ہو سکتا ہے؟

ایسا ہو رہا ہے

تم اچھا نہیں کر رہی ہو سارا۔

میں۔ فون بند کر رہی ہوں۔

کیا شادی اسی کزن سے ہو رہی ہے۔

ہوں۔ اس نے ہنکارا بھرنے کے انداز میں جواب دیا۔

اب نہیں ہوگی۔ جانے اس کی آواز میں کیا تھا کہ سارا کو اپنے وجود میں سرد لہریں دوڑتی محسوس ہونے لگیں۔

دوسری جانب کھٹاک سے فون رکھ دیا گیا۔

وہ فون کے پاس سے ہٹی تو اندر سے جیسے کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ دلدل میں دھنس چکی ہے۔

اور پھر ہوا بھی یہی۔

وہ اپنے مخصوص ٹائم پر کالج سے گھر واپس آئی تھی۔ جانے کیوں اسے گھر میں غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ امی بے حد چپ تھیں، پاپا بھی آج آفس نہیں گئے تھے۔ یہ تو اسے صبح ہی سے معلوم تھا۔

اس نے کپڑے بدلے، منہ ہاتھ دھویا۔ کچن میں جا کر کھانا کھایا۔

واپس آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔ اور گھر کی غیر معمولی کیفیت پر غور کرنے لگی۔ مگر بظاہر کوئی نتیجہ ہاتھ نہ لگا تو تھکن کے باعث جلدی سو گئی۔

شام کو اٹھی تو وہی دوپہر والا عالم تھا۔

وہ برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ امی تارا کے بال بنا رہی تھیں۔ اس کے وجود کو محسوس کر چکی تھیں مگر اسی زاویے سے بیٹھی رہیں۔ پھر تارا کو ہوم ورک کی تلقین کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

سارا۔

جی امی۔

اندر آؤ۔ ان کا طرز عمل اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

وہ اس کے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

سارا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ لوگ بیٹی کی پیدائش پر بجھ کیوں جاتے ہیں۔ کیونکہ جوان ہونے پر والدین کی عزت کی ٹھیکیداری اسے مل جاتی ہے۔

سارا کا دل انجانے خدشات سے لرزنے لگا۔

سارا۔ ہم نے تمہارے ساتھ کبھی برا نہیں کیا۔ سمیع سے زیادہ اہمیت دی۔ ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

سارا کے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی تھی۔

امی اٹھیں اور ایک بڑا سا سفید لفافہ دراز میں سے نکال کر لائیں۔

اسے پڑھو۔ پڑھو۔ میرے سامنے۔

سارا نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر دیکھا اس میں کئی کاغذات تھے۔ اس نے باریک سفید لفافہ پہلے کھولا یہ لاہور سے خالہ جان کا خط تھا۔

ساجدہ

خوش رہو۔

سمجھ میں نہیں آرہا کہاں سے شروع کروں۔ تم میری چھوٹی سگی اور لاڈلی بہن ہو۔ جو میں لکھنے جارہی ہوں شاید تو تصور بھی نہ کرسکو کہ یہ سب لکھتے ہو کتنی اذیت سے گزر رہی ہوں۔

ساجدہ انسان کو اپنے تمام اعضاء عزیز ہوتے ہیں لیکن کسی عضو کی وجہ سے تمام جسم میں زہر پھیلنے کا خدشہ ہو تو اسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس عضو کی بنا پر ایک ادھورے پن کا احساس مستقل ہو جاتا ہے۔

آخر جوان لڑکیوں کو یہ احساس کیوں نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باپ کی دستار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یقین کرو جب منصور نے یہ سب چیزیں جو میں تمہیں بھیج رہی ہوں لاکر میرے سامنے رکھیں تو جیسے میرے خون کی گردش رک گئی۔ شاید منصور میرے اصرار پر سارا کو اپنا ہی لیتا۔ لیکن سارا سے ایسا بھیانک غلطی سرزد ہوگئی ہے کہ شاید اسے کوئی اپاہج شخص بھی اپنانا گوارا نہ کرے۔

میری بہن اب تو تم بھی لاعلم نہیں ہوگی کہ جب لاہور تک آگ آگئی ہے۔

تو پھر یہ تو آگ بھی تمہارے گھر کی ہے۔

مجھے بیحد صدمہ ہے کہ تمہاری اولاد نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا،

میں ہر قسم کی مدد سے قاصر ہوں۔ فقط

تمہاری آپا۔

سارا کے جسم سے گویا کسی نے خون نچوڑ لیا۔ اس نے دوسرے کاغذات دیکھے۔ اس کے خطوط تھے۔ جو اس نے منوچہر کو لکھے تھے بلکہ ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیں تھیں۔ ایک خط منوچہر کا بنام منصور تھا۔ جس میں سارا کے متعلق بہتان بھی تھے۔ کہ جنہیں سن کر زمین کا سینہ بھی شق ہو جا۔

وہ کھڑی نہ رہ سکی۔

نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔

کون ہے یہ؟ امی کی شکستہ آواز ابھری

سارا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سارا۔ تجھے اب ساری عمر رونا ہے۔ بتا۔ کون ہے یہ؟

امی۔ یقین کریں امی اس خط میں جو لکھا ہے غلط ہے۔ اس نے منوچہر کا خط ماں کے آگے کیا۔

مجھے یقین آبھی جاتا تو کیا اور اسی یقین و اعتماد نے یہ گل کھلا ہیں۔ سارا۔ اس کا پتا بتادو۔ تا کہ پالی فرصت میں تمہیں اس کے ساتھ رخصت کردیا جا۔

سارا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ کبھی یہ بات اسے دیوانے کا خواب معلوم ہوتی تھی۔

امی۔ میں نے اسے نہیں چاہا تھا۔ امی آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔

سارا لوگ جب تیرے حُسن پر رشک کرتے تھے تو مجھے تیری خوبصورتی سے خوف آتا تھا۔ کتنا صحیح خوف آتا تھا۔ اس کی تروتازہ سی ماں کیسی بوڑھی سی لگنے لگی تھی۔

اس نے رو رو کر الف سے لے کر ے تک تمام بات سنا دی۔

وہ سر جھکائے سنتی رہیں۔

اور وہ جو اس نے خط میں لکھا ہے۔ وہ جھجک کر رُک گئی تھیں۔

امی خدا کی قسم میں نے تو اس سے ہاتھ تک نہیں ملایا کبھی۔ بہتان ہے مجھ پر اس گھر میں رہتی ہوں۔ آپ کی نظروں کے سامنے۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اب اس قدر بھی نابینا نہیں تھیں وہ۔ چار بچوں کی ماں تھیں۔

لیکن سارا اب وہ جو کوئی بھی ہے۔ تجھے اسی کو اپنانا ہوگا کہ اس نے تجھے کسی اور کے قابل نہیں رکھا۔

خدا کے لیے امی۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ مجھے اس شکل سے نفرت ہے۔ میں مر جاوں گی۔ میں ایک لمحہ اس کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ پھر ساری عمر۔

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ ساجدہ اسے غور سے دیکھتی رہیں۔

پھر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ سارا تو نے سب کے پاؤں تلے انگارے بچھا دیے ہیں۔ تو نے

اپنے بھائی سے مردانگی کا غرور چھین لیا ہے۔ یہ شاید تجھے ساری عمر معاف نہ کر سکیں۔

وہ باہر نکل گئیں۔ وہ دیر تک تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔

واقعتاً۔ اسے منوچہر سے اس قسم کے اقدام کی توقع نہیں تھی۔

اتنا بڑا شرمناک الزام۔ اس کا جی چاہا کچھ کھا کر سو رہے۔

خود پھول کی طرح مجھے کھلنے کا شوق تھا
اب تیز ہے ہوا، تو ہوا کا قصور کیا

اسے منوچہر کا کوئی خط نہیں ملا مگر پاپا کے پاس دھمکی آمیز فون آئے۔ وہ سارا سے فوری نکاح مانگ رہا تھا۔ سارا کی ایک ہی گردان تھی۔ نہیں۔ نہیں۔

ایک روز پاپا کو ٹائپ لیٹر ملا۔

جس میں منوچہر نے اپنی اولین پسند کو اُٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی۔ لکھا تھا وہ ایک بااثر زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔

اب تک اس نے شرافت کا مظاہرہ کیا ہے۔

ساجدہ کا ایک دل کہتا کہ اس مصیبت کو انگلی سے پکڑ کر منوچہر کے در پر چھوڑ آئیں۔ پھر بیٹی کے اعترافات میں سے ایک جملہ ان کے کانوں میں گونجنے لگتا۔

امی۔ وہ ایسا نہیں لگتا تھا۔ میری شادی اس سے کرنے سے بہتر ہے آپ مجھے جان سے مار دیں۔

کئی دن ایسے گزرے کی کھانے پینے تک کا ہوش نہیں تھا۔ پولیس سے مدد لینا مزید مشکلات ومصیبت مول لینا تھا۔ بات ابھی حدود میں ہی تھی۔

ایک شام امی نے اسے تیار ہونے کو کہا اور یہ کہ وہ اپنے چند جوڑے سوٹ کیس میں ڈال لے۔ اس نے گھبرا کر ماں کی صورت دیکھی۔

تمہارے ماموں حفیظ پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ٹیچر ہیں۔ معلوم ہے تمہیں۔

اس سے قبل کے وہ دھمکی کو عملی جامہ پہنائے ۔ تمہیں وہاں چھوڑ آتے ہیں۔ پھر ہم خود یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے۔ کیسا ہارا ہوا انداز تھا ان کا۔

ایک طویل سفر کے بعد۔ وہ اس گاو ں میں آئے تھے۔

امی نے بھائی کو ڈھکے چھپے الفاظ میں بات بتا کر ان سے مدد کی التجا کی۔ بھائی بہن کے المیے پر رو پڑا تھا۔ اور کوئی اسے دیکھتا جس کی پلکوں پر منوں بوجھ رکھے تھے۔ حفیظ ماموں خود بے اولاد تھے گزشتہ سال ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب بالکل تنہا تھے۔

جب امی جانے لگیں تو وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

امی مجھے معاف کر دیجیے گا۔

انہوں نے آہستگی سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔

بچے ماں باپ کی احتیاط کو ان کی حماقت سمجھتے ہیں۔ تو نے ان کٹھن حالات میں اندازہ کر لیا ہوگا۔ ماں باپ کیا ہوتے ہیں۔؟ یہی کچھ اگر تو کسی اور کے ساتھ یہ کچھ کرتی تو تیری سات پشتوں کو بھگتان بھگتنا پڑتے،، بھگتنے تو شاید اب بھی پڑیں تو جہنم میں کودی ہے سارا ہم نے تیرے لی ے بہت خوبصورت خواب دیکھے تھے۔

وہ سسک پڑیں۔

ماموں جان نے بہن سے بہنوئی کی شکستگی پر اپنے دل میں طوفان سے اُٹھتے محسوس کیے تھے۔ وہ انہیں شہر جانے والی بس میں بٹھا کر آ گے تھے۔ اس بس نے انہیں لاہور اسٹیشن پر پہنچا دیا تھا۔

وہ واپس ہوے تو وہ ڈیوڑھی میں پتھر کی طرح ایستادہ تھی۔

پیاسا ہوں ریگزار بھی دریا دکھائی دے
جو حال پوچھ لے وہ مسیحا دکھائی دے

ماموں جان نے اس سے کوئی بات نہیں دریافت کی انہیں شاید زیادہ بولنے کی عادت بھی نہیں تھی۔

اس کا بے حد خیال رکھتے اس کی زندگی تو جیسے ایک کنویں میں محدود ہو گی ۔

اس نے بار بار اپنی غلطی و جزبات پر ہاتھ ملے تھے۔ لیکن وہی مثل صادق آتی تھی۔ کہ عمر چرا کار کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔

یعنی عقل مند وہ کام ہی کیوں کرے کہ بعد میں شرمندگی اٹھائے ۔

بعض لوگ پیدائشی عقل مند نہیں ہوتے۔ انہیں ٹھوکر سے عقل آتی ہے۔ گاو ں کی لڑکیوں سے اس کی دوستی ہوگی تھی۔ کبھی کبھی ان کے ہمراہ کھیتوں باغوں میں نکل جاتی تھی۔

ایسی ہی اندھیری شام وہ اور دیہاتی لڑکی عائشہ ڈور ڈنگروں کے پیچھے باتیں کرتی آ رہی تھیں۔ دو کسرتی

ماموں کے مالک نو عمر لڑکے ان کے سامنے آ گئے۔۔ وہ دونوں ٹھٹک گئیں۔

سارا۔ دونوں نے باری باری دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر گویا اندازہ لگایا۔ پسینہ بہہ کر سارا کی ایڑیوں میں آ گیا عائشہ الگ ہکا بکا تھی۔ مالک نے کہا تھا کہ آپ سے کہوں کہ مالک یاد فرماتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

میں سارا نہیں ہوں۔ اس نے بمشکل آواز نکالی۔

مالک نے کہا تھا۔ جس کے گلابی گال پر کالا تل ہو، جو نظر جھکا کر بات کرے۔ جسے دیکھ کر زندگی سے محبت ہونے لگے۔ وہی سارا ہوگی۔ ویسے فوٹو ہے ہمارے پاس مالک نے یہ بھی بولا تھا۔ جس طرح کائنات میں ایک سورج ہے اسی طرح بس سارا بھی ایک ہے۔

ئے ہئے۔ دفع و مرے۔ ٹٹ پینے۔ عائشہ نے بھڑک کر اس نوجوان کو پیچھے دھکا دیا جو بہت بول رہا تھا۔ لیکن اس نوجوان پر دھکے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ معاً عائشہ کے منہ سے خوف زدہ سی چیخ نکلی۔

چلو۔ ریوالور کی سیاہ نال چمک رہی تھی۔ دونوں اس کی جانب متوجہ تھے۔ عائشہ آنکھ بچا کر سرپٹ دوڑ لی۔ ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ہم تو کراچی سے تم پر نگاہ رکھے ہوے ہیں۔ پر موقع بھی کوئی چیز ہوتی ہے، وہیں پکڑ لیتے تو ڈھر لئے جاتے، ویسے یہاں کام ذرا سکون سے ہوگیا۔ مالک نے کہا تھا اس زمین پر چھ براعظم اور سات سمندر اور باقی ہیں وہاں بھی جا کر دیکھ لیجئے۔ اس سے بھی بڑے گاو ں کا وارث ہے ہمارا مالک۔

عائشہ کو دوڑتے دیکھ کر اس کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے ریوالور سے اسے کور کر رکھا تھا۔

انٹر کان لاہور میں مالک آپ کے منتظر ہیں۔

کک کک۔ کک۔ کون ہو تم لوگ۔

ہم جو بھی ہین اپنے مالک کی روٹیوں پر پلے ہیں۔ اب تک بڑی تمیز سے پیش آ رہے ہیں کہ ہونے والی مالکن ہو مگر۔

اس نے محسوس کیا چارون طرف سناٹا ہے۔

آگے بڑھو۔ وہ اسے ہنکانے لگے۔ لیکن ان کی ٹانگیں تو جیسے بے جان ہوگئی تھیں۔

دونوں نے اسے بازوو ں سے تھام لیا اور تقریباً گھسیٹنے لگے۔ معاً تڑ تڑ کی آوازیں فضا میں گونجیں۔ وہ تیورا کر زمین پر گر گئی تھی۔ کافی دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے چاروں سمت دیکھا ماموں کے ہاں ہی تھی بڑے کمرے میں۔

ماں باپ کا قصور یہ تھا کہ وہ اس کے ماں باپ تھے ماموں کا نا کردہ گناہ بھی یہی رقم ہوا تھا کہ وہ سارا کے ماموں تھے۔

عائشہ کو راستے میں بھائی مل گیا تھا۔ جسے اس نے جلدی جلدی تمام بات بتائی اس نے نمبردار کے لڑکے کو ساتھ لیا اور مدد کو پہنچ گیا تھا۔

رائفل نمبردار کے پاس تھی یوسف نہتا تھا۔ اور گولیوں سے بال بال بچا تھا۔ پہلی گولی کی آواز پر جانے کہاں سے دوسرے دیہاتی نمودار ہوے ۔

دونوں نوجوانوں کو پانچ چھ آدمیوں نے بمشکل قابو کیا۔

ان کے ہاتھ دسیوں سے باند دیئے۔ دوران کی گاڑی کھڑی نظر آ رہی تھی۔

نہ جانے وہ نوجوان کیا اول فول بک رہے تھے یوسف معرکہ میں مگن تھا۔ عائشہ نے کھیت میں کھڑے ہو کر ساری کاروائی ملاحظہ کی۔

یادرکھو۔ یہ لڑکی بچے گی نہیں۔ یہ ہمارے مالک کے بچے کی ماں بھی ہے۔

اختتام---------------------------The End